سعادت حسن منٹو



پھُندنے

پھندنے

(افسانے)

سعادت حسن منٹو

ٹوبہ ٹیک سنگھ

بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا تبادلہ بھی ہونا چاہیے یعنی جو مسلمان پاگل ہندوستان کے پاگل خانوں میں ہیں انہیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انہیں ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے۔

معلوم نہیں یہ بات معقول تھی یا غیر معقول' بہر حال دانشمندوں کے فیصلے کے مطابق ادھر ادھر اونچی سطح کی کانفرنسیں ہوئیں اور بل آخر ایک دن پاگلوں کے تبادلے کے لیے مقرر ہو گیا۔ اچھی طرح چھان بین کی گئی۔ وہ مسلمان پاگل جن کے لواحقین ہندوستان میں تھے۔ وہیں رہنے دیئے گئے تھے۔ جو باقی تھے ان کو سرحد پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پاکستان میں چونکہ قریب قریب تمام ہندو' سکھ جا چکے تھے۔ اس لیے کسی کو رکھنے رکھانے کا سوال ہی نہ پیدا ہوا۔ جتنے ہندو' سکھ پاگل تھے سب کے سب پولیس کی حفاظت میں بارڈر پر پہنچا دیئے گئے۔

ادھر کا معلوم نہیں' لیکن ادھر لاہور کے پاگل خانے میں جب اس تبادلہ کی خبر پہنچی تو بڑی دلچسپ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک مسلمان پاگل جو بارہ برس سے ہر روز باقاعدگی کے ساتھ ''زمیندار'' پڑھتا تھا' اس سے جب اس کے ایک دوست نے پوچھا: ''مولبی ساب! یہ پاکستان کیا ہوتا ہے؟'' تو اس نے بڑے غور و فکر کے بعد جواب دیا: ''ہندوستان میں ایک ایسی جگہ ہے جہاں استرے بنتے ہیں۔'' یہ جواب سن کر اس کا دوست مطمئن ہو گیا۔

اس طرح ایک سکھ پاگل نے ایک دوسرے سکھ پاگل سے پوچھا: ''سردار جی ہمیں ہندوستان کیوں بھیجا جا رہا ہے ہمیں تو وہاں کی بولی نہیں آتی۔''

دوسرا مسکرایا: ''مجھے تو ہندوستوڑوں کی بولی آتی ہے ہندوستانی بڑے شیطانی آکڑ آکڑ پھرتے ہیں۔''

ایک دن نہاتے نہاتے ایک مسلمان پاگل نے ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ اس زور سے بلند کیا کہ فرش پر سے پھسل کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

بعض پاگل ایسے بھی تھے جو پاگل نہیں تھے۔ ان میں اکثریت ایسے قاتلوں کی تھی جن کے رشتہ داروں نے افسروں کو دے دلا کر پاگل خانے بھجوا دیا تھا کہ پھانسی کے پھندے سے بچ جائیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کیوں تقسیم ہوا ہے اور یہ پاکستان کیا ہے۔ لیکن صحیح واقعات سے وہ بھی بے خبر تھے۔ اخباروں سے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا اور پہرہ دار سپاہی ان پڑھ اور جاہل تھے۔ ان کی گفتگوؤں سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ایک آدمی محمد علی جناح ہے جس کو قائد اعظم کہتے ہیں۔ اس نے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک بنایا ہے جس کا نام پاکستان ہے۔ یہ کہاں ہے' اس کا محل وقوع کیا ہے' اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاگل خانے میں وہ سب پاگل جن کا دماغ پوری طرح ماؤف نہیں ہوا تھا' اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ وہ پاکستان میں ہیں یا ہندوستان میں۔ اگر ہندوستان میں ہیں تو پاکستان کہاں ہے!

اگر وہ پاکستان میں ہیں تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ پہلے یہیں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں تھے!

ایک پاگل تو پاکستان اور ہندوستان' اور ہندوستان اور پاکستان کے چکر میں کچھ ایسا گرفتار ہوا کہ اور زیادہ پاگل ہو گیا۔ جھاڑو دیتے دیتے ایک دن درخت پر چڑھ گیا اور ٹہنے پر بیٹھ کر دو گھنٹے مسلسل تقریر کرتا رہا جو پاکستان اور ہندوستان کے نازک مسئلے پر تھی۔ سپاہیوں نے اسے نیچے اترنے کو کہا تو وہ اور اوپر چڑھ گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے کہا: "میں ہندوستان میں رہنا چاہتا ہوں نہ میں پاکستان میں۔ میں اس درخت پر رہوں گا۔" بڑی مشکلوں کے بعد جب اس کا دورہ سرد پڑا تو وہ نیچے اترا اور اپنے ہندو' سکھ دوستوں سے گلے مل کر رونے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل بھر آیا تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر ہندوستان چلیں جائیں گے۔

ایک ایم۔ ایس۔ سی پاس ریڈیو انجینئر جو مسلمان تھا اور دوسرے پاگلوں سے بالکل الگ تھلگ' باغ کے ایک خاص روشنی پر سارا دن خاموش ٹہلتا رہتا تھا' یہ تبدیلی نمودار ہوئی کہ اس نے تمام کپڑے اتار کر دفعدار کے حوالے کر دیئے اور ننگ دھڑنگ سارے باغ میں چلنا پھرنا شروع کر دیا۔

چنیوٹ کے ایک موٹے مسلمان پاگل نے جو مسلم لیگ کا سرگرم کارکن رہ چکا تھا اور دن میں پندرہ سولہ مرتبہ نہایا کرتا تھا' یک لخت یہ عادت ترک کر دی۔ اس کا نام محمد علی تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دن اپنے جنگلے میں اعلان کر دیا کہ وہ قائد اعظم محمد علی جناح ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی ایک سکھ پاگل ماسٹر تارا سنگھ بن گیا۔ قریب تھا کہ اس جنگلے میں خون خرابہ ہو جائے مگر دونوں کو خطرناک پاگل قرار دے کر علیحدہ علیحدہ بند کر دیا گیا۔

لاہور کا ایک نوجوان ہندو وکیل تھا جو محبت میں ناکام ہو کر پاگل ہو گیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ امرتسر ہندوستان میں چلا گیا ہے

تو اسے بہت دکھ ہوا۔ اسی شہر کی ایک ہندو لڑکی سے اسے محبت ہوئی تھی۔ گو اس نے اس وکیل کو ٹھکرا دیا تھا' مگر دیوانگی کی حالت میں بھی وہ اس کو نہیں بھولا تھا۔ چنانچہ وہ ان تمام ہندو اور مسلم لیڈروں کو گالیاں دیتا تھا جنہوں نے مل ملا کر ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اس کی محبوبہ ہندوستانی بن گئی تھی اور وہ پاکستانی۔

جب تبادلے کی بات چیت شروع ہوئی تو وکیل کو کئی پاگلوں نے سمجھایا کہ وہ دل برا نہ کرے' اس کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔ اس ہندوستان میں جہاں اس کی محبوبہ رہتی ہے۔ مگر وہ لاہور چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے کہ اس کا خیال تھا کہ امرتسر میں اس کی پریکٹس نہیں چلے گی۔

یورپین وارڈ میں دو اینگلو انڈین پاگل تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ ہندوستان کو آزاد کر کے انگریز چلے گئے ہیں تو ان کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ چھپ چھپ کر گھنٹوں آپس میں اس اہم مسئلے پر گفتگو کرتے رہتے کہ پاگل خانے میں ان کی حیثیت کس قسم کی ہو گی۔ یورپین وارڈ رہے گا یا اڑا دیا جائے گا۔ بریک فاسٹ ملا کرے گا یا نہیں۔ کیا انہیں ڈبل روتی کی بجائے بلڈی انڈین چپاتی زہر مار نہیں کرنا پڑے گی۔

ایک سکھ تھا جس کو پاگل خانے میں داخل ہوئے پندرہ برس ہو چکے تھے۔ ہر وقت اس کی زبان پہ عجیب و غریب الفاظ سننے میں آتے تھے۔: "اوپڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لالٹین۔" دن کو سوتا تھا نہ رات کو۔ پہرہ داروں کا یہ کہنا تھا کہ پندرہ برس کے طویل عرصے میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سویا۔ لیٹا بھی نہیں تھا۔ البتہ کبھی کبھی کسی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔

ہر وقت کھڑا رہنے سے اس کے پاؤں سوج گئے تھے۔ پنڈلیاں بھی پھول گئی تھیں' مگر اس جسمانی تکلیف کے باوجود لیٹ کر آرام نہیں کرتا تھا۔ ہندوستان' پاکستان اور پاگلوں کے تبادلے کے متعلق جب کبھی پاگل خانے میں گفتگو ہوتی تھی تو وہ غور سے سنتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ اس کا کیا خیال ہے تو وہ بڑی سنجیدگی سے جواب دیتا: "اوپڑ دی گڑ گڑ دی انیکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی پاکستان گورنمنٹ۔"

لیکن بعد میں' آف دی پاکستان گورنمنٹ کی جگہ آف دی ٹوبہ ٹیک سنگھ گورنمنٹ نے لے لیا اور اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے جہاں کا وہ رہنے والا ہے۔ لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں۔ جو بتانے کی کوشش کرتے تھے وہ خود اس الجھاؤ میں گرفتار ہو جاتے تھے کہ سیالکوٹ پہلے ہندوستان میں ہوتا تھا پر اب سنا ہے

کہ اب پاکستان میں ہے' کیا پتہ لاہور جو اب پاکستان میں ہے کل ہندوستان میں چلا جائے۔ یا سارا ہندوستان ہی پاکستان بن جائے' اور یہ بھی کون سینے پر ہاتھ رکھ کر کہ سکتا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کسی دن سرے سے غائب ہو جائیں۔

اس سکھ پاگل کے کیس چھدرے ہو کر بہت مختصر رہ گئے تھے۔ چونکہ بہت کم نہاتا تھا اس لیے داڑھی اور سر کے بال آپس میں جم گئے تھے جس کے باعث اس کی شکل بڑی بھیانک ہو گئی تھی۔ مگر آدمی بے ضرر تھا۔ پندرہ برسوں میں اس نے کبھی کسی سے جھگڑا فساد نہیں کیا تھا۔ پاگل خانے کے جو پرانے ملازم تھے' وہ اس کے متعلق جانتے تھے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کی زمینیں تھیں۔ اچھا کھاتا پیتا زمیندار تھا کہ اچانک دماغ الٹ گیا۔ اس کے رشتہ دار لوہے کی موٹی زنجیروں میں اسے باندھ کر لائے اور پاگل خانے میں داخل کرا گئے۔

مہینے میں ایک بار ملاقات کے لیے یہ لوگ آتے تھے اور اس کی خیر خیریت دریافت کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب پاکستان' ہندوستان کی گڑبڑ شروع ہوئی تو ان کا آنا بند ہو گیا۔

اس کا نام بشن سنگھ تھا مگر سب اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ کہتے تھے۔ اس کو یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ دن کون سا ہے' مہینہ کون سا ہے یا کتنے سال بیت چکے ہیں۔ لیکن ہر مہینہ جب اس کے عزیز و اقارب اس سے ملنے کے لیے آتے تھے تو اسے اپنا آپ پتا چل جاتا تھا۔ چنانچہ وہ دفعدار سے کہتا کہ اس کی ملاقات آ رہی ہے۔ اس دن وہ اچھی طرح نہاتا' بدن پر خوب صابن گھستا اور سر میں تیل لگا کر کنگھا کرتا۔ اپنے کپڑے جو وہ کبھی استعمال نہیں کرتا تھا' نکلوا کے پہنتا اور یوں سج بن کر ملنے والوں کے پاس جاتا۔ وہ اس سے کچھ پوچھتے تو وہ خاموش رہتا یا کبھی کبھار "او پڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف دی لال ٹین" کہہ دیتا۔ اس کی ایک لڑکی تھی جو ہر مہینے ایک انگلی بڑھتی بڑھتی پندرہ برسوں میں جوان ہو گئی تھی۔ بشن سنگھ اسے پہچانتا ہی نہیں تھا۔ وہ بچی تھی جب بھی اپنے باپ کو دیکھ کر روتی تھی' جوان ہوئی تب بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے۔

پاکستان اور ہندوستان کا قصہ شروع ہوا تو اس نے دوسرے پاگلوں سے پوچھنا شروع کیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ جب اطمینان بخش جواب نہ ملا تو اس کی کرید دن بدن بڑھتی گئی۔ اب ملاقات بھی نہیں آتی تھی۔ پہلے تو اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا تھا کہ ملنے والے آ رہے ہیں پر اب جیسے اس کی دل کی آواز بند ہو گئی تھی جو اسے ان کی آمد کی خبر دے دیا کرتی تھی۔ اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ لوگ آئیں جو اس سے ہمدردی کا اظہار کرتے تھے اور اس کے لیے پھل مٹھائیاں اور کپڑے لاتے تھے۔ وہ اگر ان سے پوچھتا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے تو وہ یقیناً بتا دیتے کہ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ہی

سے آتے ہیں جہاں اس کی زمینیں ہیں۔

پاگل خانے میں ایک پاگل ایسا بھی تھا جو خود کو خدا کہتا تھا۔ اس سے جب ایک روز بشن سنگھ نے پوچھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے یا ہندوستان میں تو اس نے حسب عادت قہقہہ لگایا اور کہا: "وہ پاکستان میں ہے نہ ہندوستان میں۔ اس لیے کہ ہم نے ابھی تک حکم نہیں دیا۔" بشن سنگھ اس خدا سے کئی مرتبہ بڑی منت سماجت سے کہا کہ وہ حکم دے دے تاکہ جھنجھٹ ختم ہو' مگر وہ بہت مصروف تھا اس لیے کہ اسے بے شمار حکم دینے تھے۔ ایک دن تنگ آ کر وہ اس پر برس پڑا: "اوپڑ دی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی دال آف واہے گورو جی دا خالصہ اینڈ واہے گورو جی کی فتح۔ جو بولے سو نہال' ست سری اکال۔" اس کا شاید یہ مطلب تھا کہ تم مسلمانوں کے خدا ہو۔ سکھوں کے خدا ہوتے تو ضرور میری سنتے۔

تبادلے سے کچھ دن پہلے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ایک مسلمان جو اس کا دوست تھا' ملاقات کے لیے آیا۔ پہلے وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ جب بشن سنگھ نے اسے دیکھا تو ایک طرف ہٹ گیا اور واپس جانے لگا مگر سپاہیوں نے اسے روکا: "یہ تم سے ملنے آیا ہے۔ تمہارا دوست فضل دین ہے۔"

بشن سنگھ نے فضل دین کو ایک نظر دیکھا اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ فضل دین نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا: "میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ تم سے ملوں لیکن فرصت نہ ملی۔ تمہارے سب آدمی خیریت سے ہندوستان چلے گئے۔ مجھ سے جتنی مدد ہو سکی' میں نے کی۔ تمہاری بیٹی روپ کور......."

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ بشن سنگھ کچھ یاد کرنے لگا: "بیٹی روپ کور!"

فضل دین نے رک رک کر کہا: "ہاں.... وہ.... وہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ ان کے ساتھ ہی چلی گئی۔"

بشن سنگھ خاموش رہا۔ فضل دین نے کہنا شروع کیا: "انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری خیر خیریت پوچھتا رہوں۔ اب میں نے سنا ہے کہ تم ہندوستان جا رہے ہو۔ بھائی بلبیر سنگھ اور بھائی ودھاوا سنگھ سے میرا سلام کہنا۔ اور بہن امرت کور سے بھی....... بھائی بلبیر سے کہنا فضل دین راضی خوشی ہے۔ وہ بھوری بھینسیں جو وہ چھوڑ گئے تھے' ان میں سے ایک نے کٹا دیا ہے۔ اور دوسری کے کٹی ہوئی تھی پر وہ چھ دن کی ہو کے مر گئی.......

اور....... میرے لائق کوئی خدمت ہو کہنا' میں ہر وقت تیار ہوں....... اور یہ تمہارے لیے تھوڑے سے مرونڈے لایا ہوں۔"

بشن سنگھ نے مرونڈوں کی پوٹلی لے کر پاس کھڑے سپاہی کے حوالے کر دی اور فضل دین سے پوچھا: ”ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟“ فضل دین نے قدرے حیرت سے کہا: ”کہاں ہے۔ وہیں ہے جہاں تھا۔“

بشن سنگھ نے پھر پوچھا: ”پاکستان میں یا ہندوستان میں؟“

”ہندوستان میں۔ نہیں نہیں، پاکستان میں۔“ فضل دین بوکھلا سا گیا۔

بشن سنگھ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا: ”اوپڑدی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف پاکستان اینڈ ہندوستان آف دی در فٹے منہ!

تبادلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھی۔ ادھر سے ادھر اور ادھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔

سخت سردیاں تھیں جب لاہور کے پاگل خانے میں ہندو سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لاریاں پولیس کے محافظ دستے کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہگہ کے بارڈر پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہو گیا جو رات بھر جاری رہا۔

پاگلوں کو لاریوں سے نکالنا اور ان کو دوسرے افسروں کے حوالے کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ بعض تو باہر نکلتے ہی نہیں تھے۔ جو نکلنے پر رضامند ہوتے تھے ان کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا تھا کیونکہ ادھر ادھر بھاگ اٹھتے تھے۔ جو ننگے تھے ان کو کپڑے پہنائے جاتے تو پھاڑ کر اپنے تن سے جدا کر دیتے۔ کوئی گالیاں بک رہا ہے۔ کوئی گا رہا ہے۔ آپس میں لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ رو رہے ہیں، بلک رہے ہیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پاگل عورتوں کا شور و غوغا الگ تھا اور سردی اتنی کڑاکے کی تھی کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔

پاگلوں کی اکثریت اس تبادلہ کے حق میں نہیں تھی، اس لیے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انہیں اپنی جگہ سے اکھاڑ کر کہاں پھینکا جا رہا ہے۔ وہ چند جو کچھ سوچ سمجھ سکتے تھے ”پاکستان زندہ باد“ اور ”پاکستان مردہ باد“ کے نعرے لگا رہے تھے۔ دو تین مرتبہ فساد ہوتے ہوتے بچا کیونکہ بعض مسلمان اور سکھوں کو یہ نعرے سن کر طیش آ گیا تھا۔

جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا: ”ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے۔ پاکستان میں یا ہندوستان میں؟“ متعلقہ افسر ہنسا: ”پاکستان میں۔“

یہ سن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے، مگر اس نے چلنے سے انکار کر دیا: ”ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے۔“ اور زور زور سے چلانے لگا: ”اوپڑدی گڑ گڑ دی اینکس دی بے دھیانا دی منگ دی وال آف ٹوبہ ٹیک سنگھ اینڈ پاکستان۔“

اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندوستان میں چلا گیا ہے۔ اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے گا، مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا جیسے اب اسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چونکہ بے ضرر تھا اس لیے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی۔ اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا باقی کام ہوتا رہا۔

سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی۔ ادھر ادھر سے کئی افسر دوڑے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا تھا، اوندھے منہ لیٹا ہے۔ ادھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندوستان تھا۔ ادھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان۔ درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا، ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا۔



فرشتہ

سرخ کھردرے کمبل میں عطاء اللہ نے بڑی مشکل سے کروٹ بدلی اور اپنی مندی ہوئی آنکھیں آہستہ آہستہ کھولیں۔ کھرے کے دبیز چادر میں کئی چیزیں لپٹی ہوئی تھیں جن کے صحیح خدوخال نظر نہیں آتے تھے۔ ایک لمبا' نہ ختم ہونے والا دالان تھا یا شاید کمرہ تھا جس میں دھندلی دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی روشنی جو جگہ جگہ میلی ہو رہی تھی۔

دور بہت دور' جہاں شاید یہ کمرہ یا دالان ختم ہو سکتا تھا' ایک بہت بڑا بت تھا جس کا دراز قد چھت کو پھاڑتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ عطاء اللہ کو اس کا صرف نچلا حصہ نظر آ رہا تھا جو بہت پر ہیبت تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید موت کا دیوتا ہے جو اپنی ہولناک شکل دکھانے سے قصداً گریز کر رہا ہے۔

عطاء اللہ نے ہونٹ گول کر کے اور زبان پیچھے کھینچ کر اس پر ہیبت بت کی طرف دیکھا اور سیٹی بجائی' بالکل اس طرح جس طرح کتے کو بلانے کے لئے بجائی جاتی ہے۔ سیٹی کا بجنا تھا کہ اس کمرے یا دالان کی دھندلی فضا ان گنت دھمیں لہرانے لگیں۔ لہراتے لہراتے یہ سب ایک بہت بڑے شیشے کے مرتبان میں جمع ہو گئیں جو غالباً اسپرٹ سے بھرا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ یہ مرتبان فضا میں بغیر کسی سہارے کے تیرتا' ڈولتا اس کی آنکھوں کے پاس پہنچ گیا۔ اب وہ ایک چھوٹا سا مرتبان تھا جس میں اسپرٹ کے اندر اس کا دل ڈبکیاں لگا رہا تھا اور دھڑکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

عطاء اللہ کے حلق سے دبی چیخ نکلی۔ اس مقام پر جہاں اس کا دل ہوا کرتا تھا' اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ رکھا اور بے ہوش ہو گیا۔ معلوم نہیں کتنی دیر بعد اسے ہوش آیا مگر جب اس نے آنکھیں کھولیں کہرا غائب تھا۔ وہ دیو ہیکل بت بھی۔ اس کا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا اور برف کی طرح ٹھنڈا۔ مگر اس مقام پر جہاں اس کا دل تھا ایک آگ سی لگی ہوئی تھی۔ اس آگ میں کئی چیزیں جل رہی تھیں۔

بے شمار۔ چیزیں اس کی بیوی اور بچوں کی ہڈیاں تو چیخ رہی تھیں' مگر اس کے گوشت پوست اور اس کی ہڈیوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ جھلسا دینے والی تپش میں وہ بھی یخ بستہ تھا۔

اس نے ایک دم اپنے برفیلے ہاتھوں سے اپنی زرد رو بیوی اور سوکھے مارے ہوئے بچوں کو اٹھایا اور پھینک دیا۔ اب اگ کے اس الاؤ میں عرضیوں کے پلندے کے پلندے جل رہے تھے۔ ہر زبان میں لکھی ہوئی عرضیاں۔ ان پر اس کے اپنے ہاتھ سے کئے ہوئے دستخط سب جل رہے تھے آواز پیدا کئے بغیر۔

آگ کے شعلوں کے پیچھے اسے اپنا چہرہ نظر آیا۔ پسینے سے سرد پسینے سے تر بتر۔ اس نے آگ کا ایک شعلہ پکڑا اور اس سے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر ایک طرف پھینک دیا۔ الاؤ میں گرتے ہی یہ شعلے بھیگے ہوئے اسفنج کی طرح رونے لگے عطاء اللہ کو اس کی یہ حالت دیکھ کر بڑا ترس آیا۔

عرضیاں جلتی رہیں اور عطاء اللہ دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی زرد رو بیوی نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں گندھے ہوئے آٹے کا تھال تھا۔ جلدی جلدی اس نے پیڑے بنائے اور آگ میں ڈالنا شروع کر دیئے جو آنکھ جھپکنے کی دیر میں کوئلہ بن کر سلگنے لگے۔ انہیں دیکھ کر عطاء اللہ کے پیٹ میں زور کا درد اٹھا۔ جھپٹا مار کر اس نے آخری پیڑا تھال میں سے اٹھایا اور منہ میں ڈال لیا۔ لیکن آٹا خشک تھا۔ ریت کی طرح۔ اس کا سانس رکنے لگا اور وہ پھر بے ہوش ہو گیا۔

اب اس نے ایک بے جوڑ خواب دیکھنا شروع کیا۔ ایک بہت بڑی محراب تھی جس پر جلی حروف میں یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

روز محشر میں جاں گداز بود
اولیں پرسش نماز بود

وہ فوراً پتھریلے فرش پر سجدے میں گر پڑا۔ نماز بخشوانے کے لئے دعا مانگنا چاہی مگر بھوک اس کے معدے کو اس بری طرح سے ڈسنے لگی کہ بلبلا اٹھا۔ اتنے میں کسی بڑی بارعب آواز میں پکارا:

"عطاء اللہ؟"

عطاء اللہ کھڑا ہو گیا محرابوں کے پیچھے بہت پیچھے اونچے منبر پر ایک شخص کھڑا تھا۔ مادر زاد برہنہ' اس کے ہونٹ ساکت تھے مگر آواز آ رہی تھی۔

"عطاء اللہ؟" "تم کیوں زندہ ہو؟ آدمی صرف اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک اس کو کوئی سہارا ہو ہمیں بتاؤ" کوئی ایسا سہارا ہے جس کا تمہیں سہارا ہو؟ تم بیمار ہو تمہاری بیوی آج نہیں تو کل بیمار ہو جائے گی وہ جن کا سہارہ نہیں ہوتا بیمار ہوتے ہیں زندہ درگور ہوتے ہیں۔ اس کا سہارا تم ہو جو بڑی تیزی سے ختم ہو رہا ہے تمہارے بچے بھی ختم ہو رہے ہیں کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم نے خود

اپنے آپ کو ختم نہیں کیا۔ اپنے بچوں اور اپنی بیوی کو ختم نہیں کیا۔ کیا اس خاتمے کے لئے بھی تمہیں کسی سہارے کی ضرورت ہے؟ تم رحم و کرم کے طالب ہو بے وقوف! کون تم پر رحم کرے گا۔ موت کو کیا پڑی ہے جو تمہیں مصیبتوں سے نجات دلائے۔ اس کے لئے یہ مصیبت کیا کم ہے کہ وہ موت ہے۔ کس کس کو آئے ایک صرف تم عطاء اللہ نہیں ہو تم جیسے لاکھوں عطاء اللہ اس دنیا میں موجود ہیں۔ جاؤ اپنی مصیبتوں کا علاج خود کرو وہ مریل بچوں اور فاقہ زدہ بیوی کو ہلاک کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اس بوجھ سے ہلکے ہو جاؤ تو موت خود بہ خود تمہارے قدموں میں شرمسار ہو کر چلی آئے گی۔"

عطاء اللہ غصے سے تھر تھر کانپنے لگا: "تم سب بڑے ظالم ہو بتاؤ تم کون ہو۔ اس سے پیشتر کے میں اپنی بیوی اور بچوں کو ہلاق کروں میں تمہارا خاتمہ کر دینا چاہتا ہوں۔"

مادر زاد برہنہ شخص نے قہقہہ لگایا اور کہا: "میں عطاء اللہ ہوں غور سے دیکھو۔ کیا تم اپنے اپ کو بھی نہیں پہچانتے؟"

عطاء اللہ نے اس ننگ دھڑنگ آدمی کی طرف دیکھا اور اس کی گردن جھک گئی وہ خود ہی تھا بغیر لباس کے۔ اس کا خون کھولنے لگا فرش میں سے اس نے اپنے بڑے بڑے ناخنوں سے کھرچ کھرچ کر ایک پتھر نکالا اور تان کر منبر کی طرف دیکھا اس کا سر چکرا گیا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اس میں سے لہو نکل رہا تھا۔ وہ بھاگا پتھر لیے صحن کو عبور کر کے جب باہر نکلا تو ہجوم نے اسے گھیر لیا۔ ہجوم کا ہر فرد عطاء اللہ تھا۔ جس کا ماتھا لہولہان تھا۔

بڑی مشکلوں سے وہ ہجوم کو چیر کر باہر نکلا۔ ایک تنگ و تاریک سڑک پر دیر تک چلتا رہا۔ اس کے دونوں کناروں پر حشیش اور تھوہر کے پودے اگے ہوئے تھے۔ ان میں کہیں کہیں دوسری زہریلی بوٹیاں تھیں۔ عطاء اللہ نے جیب سے بوتل نکال کر تھوہر کا عرق جمع کیا۔ پھر زہریلی بوٹیوں کے پتے توڑ کر اس میں ڈالے اور انہیں ہلاتا ہلاتا اس موڑ پر پہنچ گیا جہاں سے کچھ فاصلے پر اس کا مکان تھا شکستہ اینٹوں کا ڈھیر۔

ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ ہٹا کر وہ اندر داخل ہوا۔ سامنے طاق میں مٹی کے تیل کی کپی سے کافی روشنی نکل رہی تھی۔ اس غبالی روشنی میں اس نے دیکھا کہ جھلنگی پلنگڑی پر اس کے دونوں مریل بچے مرے پڑے ہیں۔

عطاء اللہ کو بہت ناامیدی ہوئی۔ بوتل جیب مین رکھ کر جب پلنگڑی کے پاس گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ پھٹی پرانی گدڑی جو اس کے بچوں پر پڑی ہے آہستہ آہستہ ہل رہی ہے۔ عطاء اللہ بہت خوش ہوا وہ زندہ تھے۔ بوتل جیب سے نکال کر فرش پر بیٹھ گیا۔ دونوں لڑکے تھے۔ ایک چار برس کا دوسرا پانچ کا دونوں بھوکے تھے۔ دونوں ہڈیوں کا ڈھانچہ تھے۔ گدڑی ایک طرف ہٹا کر

جب عطاء اللہ نے انہیں غور سے دیکھا تو اسے تعجب ہوا کہ اتنے چھوٹے بچے اتنی سوکھی ہڈیوں پر اتنی دیر سے کیسے زندہ ہیں۔ اس نے زہر کی شیشی ایک طرف رکھ دی اور انگلیوں سے ایک بچے کی گردن ٹٹولتے ٹٹولتے ایک خفیف سا جھٹکا دیا۔ ہلکی سی تڑاخ ہوئی اور بچے کی گردن ایک طرف لٹک گئی۔ عطاء اللہ بہت خوش ہوا کہ اتنی جلدی آسانی سے کام تمام ہو گیا۔ اسی خوشی میں اس نے اپنی بیوی کو پکارا: "جیناں! جیناں ادھر آؤ۔ دیکھو میں نے کتنی صفائی سے رحیم کو مار ڈالا کوئی تکلیف نہیں ہوئی اس کو۔"

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ زینب کہاں ہے؟ معلوم نہیں کہاں چلی گئی ہے؟ شاید بچوں کے لئے کسی سے کھانا مانگنے گئی ہو یا ہسپتال میں اس کی خیریت دریافت کرنے عطاء اللہ ہنسا مگر اس کی ہنسی فوراً دب گئی جب دوسرے بچے نے کروٹ بدلی اور اپنے مردہ بھائی کو ہلانا شروع کیا: "رحیم رحیم"

وہ نہ بولا تو اس نے اپنے باپ کو دیکھا۔ ہڈیوں کی چھوٹی چھوٹی سیاہ پیالیوں میں اس کی آنکھیں چمکیں: "ابا تم آ گئے۔"

عطاء اللہ نے ہولے سے کہا: "ہاں کریم میں آ گیا۔"

کریم نے اپنے استخوانی ہاتھ سے رحیم کو جھنجوڑا: "اٹھو رحیم ابا آ گئے ہسپتال سے۔"

عطاء اللہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا: "خاموش رہو وہ سو گیا ہے۔"

کریم نے اپنے باپ کا ہاتھ ہٹایا: "کیسے سو گیا ہم دونوں نے ابھی تک کچھ کھایا نہیں۔"

"تم جاگ رہے تھے؟"

"ہاں ابا۔"

"سو جاؤ گے ابھی تم۔"

"کیسے؟"

"میں سلاتا ہوں تمہیں۔" یہ کہہ کر عطاء اللہ نے اپنی سخت انگلی کریم کی گردن پر رکھی اور اس کو مروڑ دیا۔ مگر تڑاخ کی آواز پیدا نہ ہوئی۔

کریم کو بہت درد ہوا: "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔" عطاء اللہ حیرت زدہ تھا کہ اس کا یہ دوسرا لڑکا اتنا سخت جان کیوں ہے۔

"کیا تم سونا نہیں چاہتے؟"

کریم نے اپنی گردن سہلاتے ہوئے جواب دیا: "سونا چاہتا ہوں کچھ کھانے کو دے دو سو جاؤں گا۔"

عطاء اللہ نے زہر کی شیشی اٹھائی: "پہلے یہ دوا پی لو۔"

"اچھا۔" کریم نے منہ کھول دیا۔

عطاء اللہ نے ساری شیشی اس کے حلق میں انڈیل دی اور اطمینان کا سانس لیا: "اب تم گہری نیند سو جاؤ گے۔

کریم نے اپنے باپ کا ہاتھ پکڑا اور کہا: "ابا اب کچھ کھانے کو دو۔"

عطاء اللہ کو بہت کوفت ہوئی: "تم مرتے کیوں نہیں؟"

کریم یہ سن کر شپٹا سا گیا: "کیا ابا؟"

"تم مرتے کیوں نہیں میرا مطلب ہے اگر تم مر جاؤ گے تو نیند بھی آ جائے گی تمہیں"

کریم کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا باپ کیا کہہ رہا ہے: "مارتا تو اللہ میاں ہے ابا۔"

اب عطاء اللہ کی سمجھ میں آیا کہ وہ کیا کہے: "مارا کرتا تھا کبھی اب اس نے یہ کام چھوڑ دیا ہے چلو اٹھو۔"

پلنگڑی پر کریم تھوڑا سا اٹھا تو عطاء اللہ نے اسے اپنی گود میں لے لیا اور سوچنے لگا کہ وہ اللہ میاں کیسے بنے۔ ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر جب باہر گلی میں نکلا اسے یوں محسوس ہوا جیسے آسمان اس پر جھکا ہے۔ اس میں جا بجا مٹی کے تیل کی کپیاں جل رہی تھیں۔ اللہ میاں خدا جانے کہاں تھا اور زینب بھی معلوم نہیں وہ کہاں چلی گئی تھی۔

کہیں سے کچھ مانگنے گئی ہوگی عطاء اللہ ہنسنے لگا۔ لیکن فوراً اسے خیال آیا کہ اسے اللہ میاں بننا تھا سامنے موری کے پاس بہت سارے پتھر پڑے تھے۔ ان پر وہ اگر کریم کو دے مارے تو۔

مگر اس میں اتنی طاقت نہیں تھی۔ کریم اس کی گود میں تھا۔ اس نے کوشش کی اسے اپنے بازوؤں میں اٹھائے اور سر سے اوپر لے جا کر پتھروں پر پٹک دے، مگر اس کی طاقت جواب دے گئی۔ اس نے کچھ سوچا اور اپنی بیوی کو آواز دی: "جیناں جیناں۔"

زینب معلوم نہیں کہاں ہے کہیں وہ اس ڈاکٹر کے ساتھ تو نہیں چلی گئی جو ہر وقت اس سے ہمدردی کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ وہ ضرور اس کے فریب میں آ گئی ہوگی۔ میرے لئے کہیں اس نے خود کو بیچ تو نہیں دیا۔

یہ سوچتے ہوئے اس کا خون کھول اٹھا۔ کریم کو پاس بہتی ہوئی بدرو میں پھینک کر وہ ہسپتال کی طرف بھاگا اتنا تیز دوڑا کہ چند منٹ میں ہی ہسپتال پہنچ گیا۔

رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ جب وہ اپنے وارڈ کے برآمدے میں پہنچا تو آوازیں سنائی دیں۔ ایک اس کی بیوی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی: "تم دغا باز ہو تم نے مجھے دھوکا دیا ہے اس سے جو کچھ تمہیں ملا ہے تم نے اپنی جیب میں ڈال لیا ہے۔"

کسی مرد کی آواز سنائی دی: "تم غلط کہتی ہو تم اس کو پسند نہیں آئیں اس لئے وہ چلا گیا۔"

اس کی بیوی دیوانہ وار چلائی: "بکواس کرتے ہو ٹھیک ہے کہ میں دو بچوں کی ماں ہوں۔ میرا وہ پہلا سا رنگ روپ نہیں رہا لیکن وہ مجھے قبول کر لیتا اگر تم بھانجی نہ مارتے تم بہت ظالم ہو بڑے کٹھور ہو" اس کی آواز گلے میں رندھنے لگی: "میں کبھی تمہارے ساتھ نہ چلتی، میں کبھی ذلت میں نہ گرتی اگر میرا خاوند بیمار اور میرے بچے کئی دنوں کے بھوکے نہ ہوتے تم نے کیوں یہ ظلم کیا؟"

اس مرد نے جواب دیا: "وہ کوئی بھی نہیں تھا، وہ میں خود تھا، جب تم میرے ساتھ چل پڑیں تو میں خود کو پہچانا، اور تم سے کہا کہ وہ چلا گیا ہے۔ وہ جس کے لئے میں تمہیں لایا تھا، مجھے معلوم ہے کہ تمہارا خاوند مر جائے گا، تمہارے بچے مر جائیں گے، تم بھی مر جاؤ گی، لیکن......."

"لیکن کیا۔" اس کی بیوی نے تیکھی آواز میں پوچھا۔

"میں مرتے دم تک زندہ رہوں گا، تم نے مجھے اس زندگی سے بچا لیا جو موت سے کہیں زیادہ خوفناک ہوتی۔ چلو آؤ عطاء اللہ ہمیں بلا رہا ہے۔"

"عطاء اللہ یہاں کھڑا ہے۔" عطاء اللہ نے بھنچی ہوئی آواز میں کہا۔

دو سائے پلٹے، اس سے کچھ فاصلے پر وہ ڈاکٹر کھڑا تھا جو زینب سے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اس کے منہ سے صرف اس قدر نکل سکا تھا: "تم!"

"ہاں، میں....... تمہاری سب باتیں سن چکا ہوں۔" یہ کہہ کر عطاء اللہ نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا: "جیناں میں رحیم اور کریم دونوں کو مار ڈالا ہے اب میں اور تم باقی رہ گئے ہیں۔"

زینب چیخی: "مار ڈالا تم نے دونوں بچوں کو؟"

عطاء اللہ نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا: "ہاں انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی میرا خیال ہے تمہیں بھی کوئی تکلیف نہیں۔ ڈاکٹر صاحب موجود ہیں:"

ڈاکٹر کانپنے لگا' عطاء اللہ آگے بڑھا اور اس سے مخاطب ہوا: "ایسا انجکشن دے دو کہ فوراً مر جائے۔"

ڈاکٹر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا بیگ کھولا اور سرنج میں زہر بھر کے زینب کے ٹیکا لگا دیا۔ ٹیکہ لگتے ہی وہ فرش پر گری اور مر گئی۔ اس کی زبان پر آخری الفاظ "میرے بچے' میرے بچے" تھے' مگر اچھی طرح ادا نہ ہو سکے۔ عطاء اللہ نے اطمینان کا سانس لیا: "چلو یہ بھی ہو گیا' اب میں باقی رہ گیا ہوں"

"لیکن میرے پاس زہر ختم ہو گیا ہے۔" ڈاکٹر کے لہجے میں لکنت تھی۔

عطاء اللہ تھوڑی دیر کے لیے پریشان ہو گیا' لیکن فوراً سنبھل کر اس نے ڈاکٹر سے کہا: "کوئی بات نہیں میں اندر اپنے بستر پر لیٹتا ہوں' تم بھاگ کر زہر لے کر آؤ۔"

بستر پر لیٹ کر سرخ کھردرے کمبل میں اسنے بڑی مشکل سے کروٹ بدلی اور اپنی مندی ہوئی آنکھیں آہستہ آہستہ کھولیں۔ کمرے کی چادر میں کئی چیزیں لپٹی ہوئی تھیں جن کے صحیح خدوخال نظر نہیں آتے تھے' ایک لمبا بہت لمبا نہ ختم ہونے والا دالان تھا' یا شاید کمرہ جس میں دھندلی دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی روشنی جو جگہ جگہ میلی ہو رہی تھی۔

دور بہت دور ایک فرشتہ کھڑا تھا۔ جب وہ آگے بڑھنے لگا تو چھوٹا ہوتا ہو گیا۔ چارپائی کے پاس پہنچ کر وہ ڈاکٹر بن گیا۔ وہی ڈاکٹر جو ہر وقت اس کی بیوی سے ہمدردی کا اظہار کرتا تھا۔ اور بڑے پیار سے دلاسہ دیتا تھا۔

عطاء اللہ نے اسے پہچانا تو اٹھنے کی کوشش کی: "آیئے ڈاکٹر صاحب!"

مگر وہ ایک دم غائب ہو گیا۔ عطاء اللہ لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ کہرا دور ہو چکا تھا۔ معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا تھا۔

اس کا دماغ بھی صاف تھا۔ ایک دم وارڈ میں شور بلند ہوا۔ سب سے اونچی آواز جو چیخ سے مشابہ تھی' زینب کی تھی اس کی بیوی' وہ کچھ کہہ رہی تھی' معلوم نہیں کیا کہہ رہی تھی۔ عطاء اللہ نے اٹھنے کی کوشش کی۔ زینب کو آواز دینے کی کوشش کی مگر ناکام رہا' دھند پھر چھانے لگی اور وارڈ لمبا' بہت لمبا ہوتا چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد زینب آئی۔ اس کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے عطاء اللہ کو جھنجوڑنا شروع کیا: "میں نے اسے مار ڈالا ہے' میں نے اس حرام زادے کو مار ڈالا ہے۔"

"کس کو؟"

اس کو جو مجھ سے اتنی ہمدردی جتایا کرتا تھا...... اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تمہیں بچا لے گا...... وہ جھوٹا تھا...... وہ جھوٹا تھا دغا باز تھا اس کا دل توے کی کالک سے بھی زیادہ کالا تھا۔ اس نے مجھے اس نے مجھے" اس کے آگے زینب کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

عطاء اللہ کے دماغ میں بے شمار خیالات آئے اور آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ "تمہیں تو اس نے مار ڈالا تھا؟"

زینب چیخی: "نہیں میں نے اسے مار ڈالا ہے۔"

عطاء اللہ چند لمحے خلا میں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے زینب کو ایک طرف ہاتھ سے ہٹایا: "تم ادھر ہو جاؤ' وہ آ رہا ہے۔"

"کون؟"

"وہی ڈاکٹر' وہی فرشتہ۔"

فرشتہ آہستہ آہستہ اس کی چارپائی کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں زہر بھری سرنج تھی۔ عطاء اللہ مسکرایا: "لے آئے؟"

فرشتے نے اثبات میں سر ہلایا: "ہاں لے آیا۔"

عطاء اللہ نے اپنا لرزاں بازو اس کی طرف بڑھایا: "تو لگا دو۔"

فرشتے نے سوئی اس کے بازو میں گھونپ دی۔

عطاء اللہ مر گیا۔

زینب اسے جھنجوڑنے لگی: "اٹھو اٹھو! کریم' رحیم کے ابا اٹھو یہ ہسپتال بہت بری جگہ ہے' چلو گھر چلیں۔"

تھوڑی دیر بعد پولیس آئی اور زینب کو اس کے خاوند کی لاش پر سے ہٹا کر اپنے ساتھ لے گئی!

◆◆◆

پھندنے

کوٹھی سے ملحقہ وسیع و عریض باغ میں جھاڑیوں کے پیچھے ایک بلی نے بچے دیئے تھے جو بلا کھا گیا تھا۔ پھر ایک کتیا نے بچے دیئے تھے جو بڑے بڑے ہو گئے تھے اور دن رات کوٹھی کے باہر اندر بھونکتے اور گندگی بکھیرتے رہتے تھے۔ ان کو زہر دے دیا گیا۔ ایک ایک کر کے سب مر گئے تھے۔ ان کی ماں بھی' ان کا باپ معلوم نہیں کہاں تھا۔ وہ ہوتا تو اس کی موت بھی یقینی تھی۔ جانے کتنے برس گزر چکے تھے۔ کوٹھی سے ملحقہ باغ کی جھاڑیاں سینکڑوں ہزار مرتبہ کتری بیونتی' کاٹی چھانٹی جا چکی تھیں۔ کئی بلیوں اور کتیوں نے اس کے پیچھے بچے دیئے تھے جن کا نام و نشان نہ رہا تھا۔ اس کی اکثر بدعادت مرغیاں وہاں انڈے دے دیا کرتی تھیں۔ جن کو ہر صبح اٹھا کر وہ اندر لے جاتی تھی۔

اس باغ میں کسی آدمی نے ان کی نوجوان ملازمہ کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔ اس کے گلے میں اس کا پھندنوں والا سرخ ریشمی ازار بند جو اس نے دو روز پہلے پھیری والے سے آٹھ آنے میں خریدا تھا' پھنسا ہوا تھا اس زور سے قاتل نے پیچ دیئے تھے کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔

اس کو دیکھ کر اس کو اتنا تیز بخار چڑھا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اور شاید ابھی تک بے ہوش تھی۔ لیکن نہیں ایسا کیونکر ہو سکتا تھا' اس لئے کہ اس قتل کے دیر بعد مرغیوں نے انڈے نہیں بلیوں نے بچے دیئے تھے اور ایک شادی ہوئی تھی۔ کتیا تھی جس کے گلے میں لال دوپٹہ تھا۔ مکیشی جھلمل جھلمل کرتا۔ اس کی آنکھیں باہر نکلی ہوئی نہیں تھیں' اندر دھنسی ہوئی تھیں۔

باغ میں بینڈ بجا تھا' سرخ وردیوں والے سپاہی آئے تھے جو رنگ برنگی مشقیں بغلوں میں دبا کر منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالتے تھے۔ ان کی وردیوں کے ساتھ کئی پھندنے لگے تھے۔ جنہیں اٹھا اٹھا کر لوگ اپنے ازار بندوں میں لگائے جاتے تھے پر جب صبح ہوئی تو ان کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ سب کو زہر دے دیا گیا تھا۔

دلہن کو جانے کیا سوجھی' کم بخت جھاڑیوں کے پیچھے نہیں' اپنے بستر پر صرف ایک بچہ دیا۔ جو بڑا گل گوتھنا تھا' لال پھندنا تھا۔ اس کی ماں مر گئی' باپ بھی' دونوں کو بچے نے مارا اس کا باپ معلوم نہیں کہاں تھا۔ وہ ہوتا تو اس کی موت بھی ان دونوں کے ساتھ ہوتی۔

سرخ وردیوں والے سپاہی بڑے بڑے پھندنے لٹکائے جانے کہاں غائب ہوئے پھر نہ آئے۔ باغ میں بلے گھومتے تھے جو اسے گھورتے تھے اس کو چھچھڑوں کی بھری ہوئی ٹوکری سمجھتے تھے حالانکہ ٹوکری میں نارنگیاں تھیں۔

ایک دن اس نے ٹوکری سے دو نارنگیاں نکال کر آئینے کے سامنے رکھ دیں۔ اس کے پیچھے ہو کر اس نے ان کو دیکھا مگر نظر نہ آئیں۔ اس نے سوچا اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی ہیں' مگر وہ اس کے سوچتے سوچتے ہی بڑی ہو گئیں اور اس نے ریشمی کپڑے میں لپیٹ کر آتش دان پر رکھ دیں

اب کتے بھونکنے لگے نارنگیاں فرش پر لڑھکنے لگیں۔ کوٹھی کے ہر فرش پر اچھلیں' ہر کمرے میں کودیں اور اچھلتی کودتی بڑے بڑے باغوں میں دوڑنے لگیں' کتے ان سے کھیلتے اور آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے۔

جانے کیا ہوا' ان کتوں میں دو زہر کھا کر مر گئے۔ جو باقی بچے' ان کی ادھیڑ عمر کی ملازمہ کھا گئی۔ یہ اس نوجوان ملازمہ کی جگہ آئی تھی' جس کو کسی آدمی نے قتل کر دیا تھا' گلے میں اس کے پھندنوں والے ازار بند کا پھندا ڈال کر۔

اس کی ماں تھی۔ ادھیڑ عمر کی ملازمہ سے عمر میں چھ سات سال بڑی۔ اس کی طرح ہٹی کٹی تھی۔ ہر روز صبح و شام موٹر میں سیر کو جاتی تھی۔ اور بدعادت مرغیوں کی طرح دور دراز باغوں میں جھاڑیوں کے پیچھے انڈے دیتی تھی۔ ان کو وہ خود اٹھا کر لاتی تھی نہ ڈرائیور۔ آملیٹ بناتی تھی جس کے داغ کپڑوں پر پڑ جاتے تھے۔ سوکھ جاتا تو ان کو باغ کے پیچھے جھاڑیوں میں پھینک دیتی تھی جہاں سے چیلیں اٹھا کر لے جاتی تھیں۔

ایک دن اس کی سہیلی آئی' پاکستان میل موٹر نمبر ۹۶۱۲ پی ایل بڑی گری تھی۔ ڈیڈی پہاڑ پر تھے۔ ممی سیر کرنے گئی ہوئی تھیں' پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پہلے اپنا بلاؤز اتارا اور پنکھے کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ اس کے دودھ ابلے ہوئے تھے جو آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہو گئے۔ اس کے دودھ ٹھنڈے تھے جو آہستہ آہستہ ابلنے لگے۔ آخر دونوں دودھ ابل ابل کر گنگنے ہو گئے اور کھٹی لسی بن گئے۔

اس سہیلی کا بینڈ بج گیا۔ مگر وہ وردی والے سپاہی پھندنے نچانے نہ آئے۔ ان کی جگہ پیتل کے برتن تھے' چھوٹے بڑے' جن سے آوازیں نکلتی تھیں۔ گرجدار اور دھیمی' دھیمی اور گرجدار۔

یہ سہیلی جب پھر ملی تو اس نے بتایا کہ وہ بدل گئی ہے۔ سچ مچ بدل گئی تھی۔ اس کے اب دو پیٹ تھے۔ ایک پرانا' دوسرا نیا۔ ایک کے اوپر دوسرا چڑھا ہوا تھا۔ اس کے دودھ پھٹے ہوئے تھے۔ پھر اس کے بھائی کا بینڈ بجا' ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ بہت روئی۔ اس

کے بھائی نے اسے بہت دلاسا دیا۔ بچاری کو اپنی شادی یاد آ گئی تھی۔

رات بھر اس کے بھائی اور اس کے درمیان لڑائی ہوتی رہی۔ وہ روتی رہی وہ ہنستا رہا۔ صبح ہوئی تو ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ اس کے بھائی کو دلاسہ دینے کے لئے اپنے ساتھ لے گئی۔ دلہن کو نہلا دیا گیا' اس کی شلوار میں اس کا لال پھندنوں والا آزار بند پڑا تھا۔ معلوم نہیں یہ دلہن کے گلے میں کیوں نہ باندھ گیا۔

اس کی آنکھیں بہت موٹی تھیں۔ اگر گلا زور سے گھونٹا جاتا تو وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی آنکھوں کی طرح باہر نکل آتیں اور اس کو بہت تیز بخار چڑھتا۔ مگر پہلا تو ابھی تک اترا نہیں' ہو سکتا ہے اتر گیا ہو اور یہ نیا بخار ہو جس میں وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔

اس کی ماں موٹر ڈرائیوری سیکھ رہی ہے۔ باپ ہوٹل میں رہتا ہے۔ کبھی کبھی آتا ہے اور اپنے لڑکے سے مل کر چلا جاتا ہے۔ لڑکا کبھی کبھی اپنی بیوی کو گھر بلا لیتا ہے۔ ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کو دو تین روز کے بعد کوئی یاد ستاتی ہے تو وہ رونا شروع کر دیتی ہے۔ وہ اسے دلاسہ دیتا ہے' وہ اسے پچکارتی ہے۔ اور دلہن چلی جاتی ہے۔

اب وہ اور دلہن بھابی دونوں سیر کو جاتی ہیں' سیکلی بھی' پاکستان میل۔ موٹر نمبر ۹۶۱۲ پی ایل سیر کرتے کرتے اجنتا جا نکلتی ہیں جہاں تصویریں بنانے کا کام سکھایا جاتا ہے۔ تصویروں دیکھ کر تینوں تصویر بن جاتی ہیں۔ رنگ ہی رنگ 'لال' پیلے' ہرے' نیلے سب کے سب چیخنے والے ہیں۔ ان کو ان رنگوں کا خالق چپ کراتا ہے۔ اس کے لمبے لمبے بال ہیں۔ سردیوں اور گرمیوں میں اوور کوٹ پہنتا ہے۔ اچھی شکل وصورت کا ہے۔ اندر باہر ہمیشہ کھڑاؤں استعمال کرتا ہے' اپنے رنگوں کو چپ کرانے کے بعد خود چیخنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کو یہ تینوں چپ کراتی ہیں اور خود چلانے لگتی ہیں۔

تینوں اجنتا میں مجرد آرٹ کے سینکڑوں نمونے بناتی رہیں۔ ایک کی ہر تصویر میں عورت کے دو پیٹ ہوتے ہیں۔ مختلف رنگوں کے' دوسری تصویروں میں عورت ادھیڑ عمر کی ہوتی ہے۔ ہٹی کٹی۔ تیسری کی تصویر میں پھندنے ہی پھندنے۔ ازار بندوں کا گچھا۔ مجرد تصویریں بنتی رہیں۔ مگر تینوں کے دودھ سوکھتے رہے۔ بڑی گرمی تھی اتنی کہ تینوں پسینے میں شرابور تھیں۔ خس لگے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے اپنے بلاؤز اتارے اور پنکھے کے نیچے کھڑی ہو گئیں۔ پنکھا چلتا رہا۔ دودھوں میں ٹھنڈک پیدا ہوئی نہ گرمی۔

اس کی ممی دوسرے کمرے میں تھی۔ ڈرائیور اس کے بدن سے موبل آئل پونچھ رہا تھا۔ ڈیڈی ہوٹل میں تھا جہاں اس کی لیڈی سٹینوگرافر اس کے ماتھے پر یوڈی کلون مل رہی تھی۔

ایک دن اس کا بھی بینڈ بج گیا۔ اجاڑ باغ پھر بارونق ہو گیا۔ گملوں اور دروازوں کی آرائش اجنتا اسٹیوڈیو کے مالک نے کی تھی۔ بڑی بڑی گہری لپ سٹکیں اس کے بکھیرے ہوئے رنگ دیکھ کر اڑ گئیں۔ ایک جو زیادہ سیاہی مائل تھی اتنی اڑی کے وہیں گر کر اس کی شاگرد ہو گئی۔ اس کے عروسی لباس کا ڈیزائن بھی اس نے تیار کیا تھا۔ اس نے کئی ہزار سمتیں پیدا کر دی تھیں۔ عین سامنے سے دیکھو تو وہ مختلف رنگ کے ازار بندوں کا بنڈل معلوم ہوتی تھی۔ ذرا ادھر ہٹ جاؤ تو پھلوں کی ٹوکری تھی۔ ایک طرف ہو جاؤ تو کھڑکی پر پڑا ہوا پھلکاری کا پردہ عقب میں چلے جاؤ تو کٹے ہوئے تربوزوں کا ڈھیر' ذرا زاویہ بدل کر دیکھو تو ٹماٹو ساس کا بھرا ہوا مرتبان' اوپر سے دیکھو تو یگانہ آرٹ۔ نیچے سے دیکھو تو میراجی کی مبہم شاعری۔ فن شناس نگاہیں عش عش کر اٹھیں۔ دولہا اس قدر متاثر ہو کہ شادی کے دوسرے روز ہی اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ مجرد آرٹسٹ بن جائے گا۔ چنانچہ اپنی بیوی کے ساتھ وہ اجنتا گیا۔ جہاں انہیں معلوم ہوا کہ ان کی شادی ہو رہی ہے اور وہ چند روز سے اپنی ہونے والی دلہن کے ہاں رہتا ہے۔

اس کی ہونے والی دلہن گہرے رنگ کی لپ اسٹک تھی جو دوسری لپ اسٹکوں کے کے مقابلے میں زیادہ سیاہی مائل تھی۔ شروع شروع ہی میں چند مہینوں تک اس کے شوہر اس سے اور مجرد آرٹ سے دلچسپی رہی لیکن جب اجنتا اسٹوڈیو بند ہو گیا اور اس کے مالک کی کہیں سے ممی سن گن نہ ملی تو اس نے نمک کا کاروبار شروع کر دیا۔ جو بہت نفع بخش تھا۔ اس کاروبار کے دوران میں اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی۔ جس کے دودھ سوکھے ہوئے نہیں تھے۔ یہ اس کو پسند آ گئے۔ بینڈ نہ بجا لیکن شادی ہو گئی۔ پہلی اپنے برش اٹھا کر لے گئی اور الگ رہنے لگی۔

یہ ناچاقی پہلے تو دونوں کے لیے تلخی کا موجب ہوئی لیکن بعد میں ایک عجیب وغریب مٹھاس میں تبدیل ہو گئی۔ اس کی سہیلی نے جو دوسرا شوہر تبدیل کرنے کے بعد سارے یورپ کا چکر لگا آئی تھی اور اب دق کی مریض تھی۔ اس مٹھاس کو کیوبک آرٹ میں پینٹ کیا۔ صاف شفاف چینی کے بے شمار کیوب تھے۔ جو شوہر کے پودوں کے درمیان اس انداز اوپر تلے رکھے تھے کہ ان کی دو شکلیں بن گئی تھی۔ اس پر شہد کی مکھیاں بیٹھی رس چوس رہی تھیں۔ اس کی دوسری سہیلی نے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ جب اس کو یہ المناک خبر ملی تو وہ بے ہوش ہو گئی۔ معلوم نہیں وہ بے ہوشی نئی تھی یا وہی پرانی جو بڑے تیز بخار کے بعد ظہور میں آئی تھی۔

اس کا باپ یوڈی کلون میں تھا۔ جہاں اس کا ہوٹل اس کی لیڈی سٹینوگرافر کا سر سہلاتا تھا۔ اس کی ممی نے گھر کا سارا حساب کتاب ادھیڑ عمر کی ہٹی کٹی ملازمہ کے حوالے کر دیا تھا۔ اب اس کو ڈرائیونگ آ گئی تھی مگر بہت بیمار ہو گئی تھی۔ مگر پھر بھی اس کو ڈرائیور کے بن ماں کے بلے کا بہت خیال تھا۔ وہ اس کو اپنا موبل آئل پلاتی تھی۔

اس کی بھابی اور اس کے بھائی کی زندگی بہت ادھیڑ اور ہنسی کی ہوگئی تھی۔ دونوں آپس میں بڑے پیار سے ملتے تھے کہ اچانک ایک رات جبکہ ملازمہ اس کا بھائی گھر کا حساب کتاب کر رہے تھے' اس کی بھابی نمودار ہوئی جو مجرو تھی۔ اس کے ہاتھوں میں قلم تھا نہ برش لیکن اس نے دونوں کا حساب صاف کر دیا۔

صبح کمرے سے جمے ہوئے لہو کے دو بڑے بڑے پھندنے نکلے جو اس کی بھابی کے گلے میں لگا دیے گئے۔

اب وہ قدرے ہوش میں آئی۔ خاوند سے ناچاقی کے باعث اس کی زندگی تلخ ہو کر بعد میں عجیب وغریب مٹھاس میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس نے اس کو تھوڑا سا تلخ بنانے کی کوشش کی اور شراب پینا شروع کی مگر ناکام رہی۔ اس لیے مقدار کم تھی۔ اس نے مقدار بڑھا دی۔ حتیٰ کہ وہ اس میں ڈبکیاں لینے لگی۔ لوگ سمجھتے تھے کہ اب غرق ہوئی اور اب غرق ہوئی مگر وہ سطح پر ابھر آتی تھی۔ منہ سے شراب پونچھتی ہوئی اور قہقہے لگاتی ہوئی۔

صبح کو جب اٹھتی تو اسے محسوس ہوتا کہ رات بھر اس کا جسم ذرہ ذرہ دھاریں مار مار کر روتا رہا ہے۔ اس کے وہ سب بچے جو پیدا ہو سکتے تھے' ان قبروں میں جوان کے لیے بن سکتی تھیں۔ اس دودھ کے لیے جو ان کا ہو سکتا تھا بلک بلک کر رو رہے ہیں۔ مگر اس کے دودھ کہاں تھے' وہ جنگلی بلے پی چکے تھے۔

وہ اور زیادہ پیتی کہ اتھاہ سمندر میں ڈوب جائے مگر اس کی خواہش پوری نہ ہوتی تھی۔ ذہین تھی۔ پڑھی لکھی تھی۔ جنسی موضوعات پر بغیر کسی تصنع کے بے تکلف گفتگو کرتی تھی۔ مردوں کے ساتھ جسمانی رشتہ قائم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی تھی۔ مگر پھر بھی کبھی رات کی تنہائی میں اس کا جی چاہتا کہ اپنی کسی بدعادت مرغی کی طرح جھاڑیوں کے پیچھے جائے اور ایک انڈا دے آئے۔

بالکل کھوکلی ہوگئی۔ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ باقی رہ گیا تو اس سے لوگ دور رہنے لگے وہ سمجھ گئی: چنانچہ وہ ان کے پیچھے نہ بھاگی اور اکیلی گھر میں رہنے لگی۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتی' شراب پیتی اور جانے کیا سوچتی رہتی رات کو بہت کم سوتی تھی۔ کوٹھی کے اردگرد گھومتی رہتی تھی۔

سامنے کوارٹر میں ڈرائیور کا بن ماں کا بچہ موبل آئل کے لیے روتا رہتا تھا مگر اس کی ماں کے پاس ختم ہو گیا تھا۔ ڈرائیور نے ایکسیڈنٹ کر دیا تھا۔ موٹر گیراج میں اور اس کی ماں ہسپتال میں پڑی تھی۔ جہاں اس کی ایک ٹانگ کاٹی جا چکی تھی اور دوسری کاٹی جانے والی تھی۔ وہ کبھی کبھی کوارٹر میں جھانک کر دیکھتی تو اسے محسوس ہوتا کہ اس کے دودھوں کی تہہ میں ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی ہے مگر اس بدذائقہ سے تو اس بچے کے ہونٹ بھی نہ تر ہوتے۔

اس کے بھائی نے کچھ عرصے سے باہر رہنا شروع کر دیا تھا۔ آخر ایک دن اس کا خط سوئٹزرلینڈ سے آیا کہ وہ وہاں اپنا علاج کرا رہا ہے نرس بہت اچھی ہے۔ ہسپتال سے نکلتے ہو وہ اس سے شادی کرنے والا ہے۔

ادھیڑ عمر کی ہنسی کی ملازمہ نے تھوڑا زیور کچھ نقدی اور بہت سے کپڑے جو اس کی ممی کے تھے چرائے اور چند روز کے بعد غائب ہوگئی۔ اسکے بعد اس کی ماں ہسپتال میں آپریشن ناکام ہونے کے باعث ہسپتال میں مرگئی۔

اس کا باپ جنازے میں شامل ہوا۔ اس کے بعد اس نے اس صورت نہ دیکھی اب وہ بالکل تنہا تھی۔ جتنے نوکر تھے اس نے علیحدہ کر دیئے ڈرائیور سمیت۔ اس کے بچے کے لئے اس نے ایک بار آیا رکھ دی کوئی بوجھ سوائے اس کے خیالوں کے باقی نہ رہا تھا۔ کبھی کبھار اگر کوئی اس سے ملنے آتا تو وہ اندر سے چلا اٹھتی تھی "چلے جاؤ جو کوئی بھی تم ہو چلے جاؤ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔"

سیف میں اس کو اپنی ماں کے بے شمار قیمتی زیورات ملے تھے۔ اس کے اپنے بھی تھے جن سے ان کو کوئی رغبت نہ تھی۔ مگر اب وہ رات کو گھنٹوں آئینے کے سامنے ننگی بیٹھ کر یہ تمام زیور اپنے بدن پر سجاتی اور شراب پی کر کن سری آواز میں فحش گانے گاتی تھی۔ آس پاس اور کوئی کوٹھی نہیں تھی اس لیے اسے مکمل آزادی تھی۔

اپنے جسم کو تو وہ کئی طریقوں سے ننگا کر چکی تھی۔ اب وہ چاہتی تھی کہ اپنی روح کو بھی ننگا کر دے مگر اس میں وہ زبردست محسوس حجاب کرتی تھی۔ اس حجاب کو دبانے کے لیے صرف ایک طریقہ ہی اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ وہ پیئے اور خوب پیئے اور اس حالت میں وہ اپنے ننگے بدن سے مدد لے مگر یہ بات ایک بہت بڑا المیہ تھا کہ وہ آخری حد تک ننگا ہو کر ستر پوش ہو گیا تھا۔ تصویریں بنا بنا کر وہ تھک چکی تھی۔ ایک عرصے سے اس کا پینٹنگ کا سامان صندوقچے میں بند پڑا تھا۔ لیکن ایک دن اس نے سب رنگ نکالے اور بڑے بڑے پیالوں میں گھولے تمام برش دھو دھا کر ایک طرف رکھے اور آئینے کے سامنے ننگی کھڑی ہوگئی اور اپنے جسم پر نئے خدوخال بنانا شروع کیے۔ اس کی یہ کوشش اپنے وجود کو مکمل طور پر عریاں کرنے کی تھی وہ اپنا سامنے کا حصہ ہی پینٹ کر سکتی تھی۔ دن بھر وہ اس میں مصروف رہی۔ بن کھائے پیئے آئینے کے سامنے کھڑی اپنے بدن پر مختلف رنگ جماتی اور ٹیڑھے بنگے کے مخطوط بنا رہی تھی۔ اس کے برش میں اعتماد تھا آدھی رات کے قریب اس نے دور ہٹ کر اپنا بغور جائزہ لے کر اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد اس نے تمام زیورات ایک ایک کر کے اپنے رنگوں سے لتھڑے ہوئے جسم پر سجائے اور آئینے میں ایک بار پھر غور سے دیکھا کہ ایک دم آہٹ ہوئی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا ایک آدمی چھرا ہاتھ میں لیے منہ پر ڈھاٹا باندھے کھڑا تھا جیسے حملہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر جب وہ مڑی تو حملہ

اور کے حلق سے چیخ بلند ہوئی۔ چھرا اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ افراتفری کے عالم میں کبھی ادھر کا رخ کیا کبھی ادھر کا آخر جو رستہ ملا اس میں سے بھاگ نکلا۔

وہ اس کے پیچھے بھاگی۔ چیختی پکارتی ہوئی: ''ٹھہرو ٹھہرو میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی ٹھہرو!''

مگر چور نے اس کی ایک نہ سنی اور دیوار پھاند کر غائب ہو گیا۔ مایوس ہو کر واپس آ گئی۔ دروازے کی دہلیز کے پاس چور کا خنجر پڑا تھا۔ اس نے اسے اٹھالیا اور اندر چلی گئی۔ اچانک اس کی نظریں آئینے سے دوچار ہوئیں۔ جہاں اس کا دل تھا۔ وہاں اس نے میان نما چمڑے کے رنگ کا خول سا بنایا ہوا تھا۔ اس نے اس پر خنجر رکھ کر دیکھا۔ خول بہت چھوٹا تھا۔ اس نے خنجر پھینک دیا اور بوتل میں شراب کے چار پانچ بڑے بڑے گھونٹ پی کر ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ وہ کئی بوتلیں خالی کر چکی تھی۔ کھایا کچھ بھی نہیں تھا۔

دیر تک ٹہلنے کے بعد پھر وہ آئینے کے سامنے آ گئی۔ اس کے گلے میں ازار بند نما گلوبند تھا جس کے بڑے بڑے پھندنے تھے۔ یہ اس نے برش سے بنایا تھا۔

دفعتاً اس کو ایسا محسوس ہو کہ یہ گلوبند تنگ ہونے لگا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اس کے گلے کے اندر دھنستا جا رہا ہے۔ وہ خاموش کھڑی آئینے میں آنکھیں گاڑے رہی جو اسی رفتار سے باہر نکل رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے چہرے کی تمام رگیں پھولنے لگیں۔ پھر ایک دم سے اس نے چیخ ماری اور اوندھے منہ فرش پر گر پڑی۔



بدصورتی

ساجدہ اور حامدہ دو بہنیں تھیں۔ ساجدہ چھوٹی اور حامدہ بڑی تھی۔ ساجدہ خوش شکل تھی۔ ان کے ماں باپ کو یہ مشکل درپیش تھی کہ ساجدہ کے رشتے آتے مگر حامدہ کے متعلق کوئی بات نہ کرتا۔ ساجدہ خوش شکل تھی مگر اس کے ساتھ اسے بننا سنورنا بھی آتا تھا۔ اس کے مقابلے میں حامدہ بہت سیدھی سادی تھی۔ اس کے خدوخال بھی پرکشش نہ تھے۔ ساجدہ بڑی چنچل تھی۔ دونوں جب کالج میں پڑھتی تھیں تو ساجدہ ڈراموں میں حصہ لیتی تھی۔ اس کی آواز بھی اچھی تھی سر میں گا سکتی تھی۔ حامدہ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔

کالج کی تعلیم سے فراغت ہوئی تو والدین نے ان کی شادی کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ ساجدہ کے لیے کئی رشتے آ چکے تھے' مگر حامدہ بڑی تھی اس لیے وہ چاہتے تھے کہ پہلے اس کی شادی ہو۔

اس دوران ساجدہ کی ایک خوبصورت لڑکے سے خط و کتابت شروع ہو گئی جو اس پر بہت دنوں سے مرتا تھا۔ یہ لڑکا امیر گھرانے کا تھا۔ ایم اے کر چکا تھا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکہ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اس کے ماں باپ چاہتے تھے کہ شادی ہو جائے تاکہ بیوی کو ساتھ لے جائے۔

حامدہ کو معلوم تھا کہ وہ لڑکا اس کی چھوٹی بہن سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ ایک دن جب حامدہ نے اس لڑکے کا عشقیہ جذبات سے لبریز خط دیکھا تو وہ دل ہی دل میں کڑھی' اس لیے کہ اس کے چاہنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے اس خط کا ہر لفظ بار بار پڑھا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے دل میں سوئیاں چبھ رہی ہیں۔ مگر اس نے اس درد و کرب میں بھی عجیب قسم کی لذت محسوس کی۔

لیکن وہ اپنی چھوٹی بہن پر برس پڑی:

''تمہیں شرم نہیں آتی غیر مرد سے خط و کتابت کرتی ہو!''

ساجدہ نے کہا: ''باجی اس میں کیا عیب ہے!''

''عیب! سراسر عیب ہے۔ شریف گھرانوں کی لڑکیاں کبھی ایسی بیہودہ حرکتیں نہیں کرتی۔ تم اس لڑکے حامد سے محبت کرتی ہو؟''

''ہاں''

"لعنت ہے تم پر۔"

ساجدہ بھنا گئی: "دیکھو باجی مجھ پر لعنتیں نہ بھیجو محبت کرنا کوئی جرم نہیں۔"

حامدہ چلائی: "محبت محبت آخر یہ کیا بکواس ہے۔"

ساجدہ نے بڑے طنزیہ انداز میں کہا: "جو آپ کو نصیب نہیں۔"

حامدہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے: چنانچہ کھو کھلے غصے میں آ کر اس نے چھوٹی بہن کے منہ پر زوردار تھپڑ مار دیا۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے الجھ گئیں۔

دیر تک ان میں ہاتھا پائی ہوتی رہی۔ حامدہ اس کو یہ کوسنے دیتی رہی کہ وہ ایک نامحرم مرد سے عشق لڑا رہی ہے اور ساجدہ اس سے یہ کہتی رہی کہ وہ جلتی ہے اس لیے کہ اس کی طرف کوئی مرد آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

حامدہ ڈیل ڈول کے لحاظ سے اپنی چھوٹی بہن کے مقابلے میں کافی تکڑی تھی' اس کے علاوہ اسے خار بھی تھی جس نے اس کے اندر اور بھی قوت پیدا کر دی تھی اس نے ساجدہ کو خوب پیٹا۔ اس کے گھنے بالوں کی کئی خوبصورت لٹیں نوچ ڈالیں اور خود ہانپتی کانپتی اپنے کمرے میں جا کر زاروقطار رونے لگی۔

ساجدہ نے گھر میں اس حادثے کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ حامدہ شام تک روتی رہی۔ بیشمار خیالات اس کے دماغ میں آئے وہ نادم تھی کہ اس نے محض اس لیے کہ اس سے کوئی محبت نہیں کرتا اپنی بہن کو جو نازک ہے پیٹ ڈالا۔

وہ ساجدہ کے کمرے میں گئی دستک دی اور کہا: "ساجدہ!" ساجدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

حامدہ نے پھر زور سے دستک دی اور رونے والی آواز میں پکاری: "ساجی! معافی مانگنے آئی ہوں خدا کے لیے دروازہ کھولو۔"

حامدہ نے دس پندرہ منٹ تک دلہیز کے پاس آنکھوں میں ڈبڈبائے آنسو لیے کھڑی رہی اسے یقین نہیں تھا کہ اس کی بہن دروازے کھولے گی۔ مگر وہ کھل گیا۔

ساجدہ باہر نکلی اور اپنی بڑی بہن سے ہم آغوش ہوگئی: "کیوں باجی۔ آپ رو کیوں رہی ہیں؟"

حامدہ کی آنکھوں میں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے: مجھے افسوس ہے کہ تم سے آج بیکار لڑائی ہوگئی۔

"باجی میں بہت نادم ہوں کہ میں نے آپ کے متعلق ایسی بات کہہ دی جو مجھے نہیں کہنی چاہیے تھی۔"

"تم نے اچھا کیا ساجدہ میں جانتی ہوں کہ میری شکل وصورت میں کوئی کشش نہیں خدا کرے تمہارا حسن قائم رہے۔"

"باجی! میں قطعاً حسین نہیں ہوں۔ اگر مجھ میں کوئی خوبصورتی ہے تو میں دعا کرتی ہوں کہ خدا اسے مٹا دے۔ میں آپ کی بہن ہوں' اگر آپ مجھے حکم دیں تو میں چہرے پر تیزاب ڈالنے کے لیے تیار ہوں۔"

"کیسی فضول باتیں کرتی ہو' کیا بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ تمہیں حامد قبول کرے گا؟"

"مجھے یقین ہے۔"

"کس بات کا؟"

"وہ مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ اگر میں مر جاؤں تو وہ میری لاش سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوگا۔"

"یہ محض بکواس ہے۔"

"ہوگی' لیکن مجھے اس کا یقین ہے آپ اس کے سارے خط پڑھتی رہی ہیں کیا ان سے آپ کو یہ پتا نہیں چلا کہ وہ مجھ سے کیا کیا پیمان کر چکا ہے۔"

"ساجی..... " یہ کہہ کر حامدہ رک گئی۔ تھوڑے وقفے کے بعد اس نے لرزاں آواز میں کہا: "میں عہد و پیمان کے متعلق کچھ نہیں جانتی" اور رونا شروع کر دیا۔

اس کی چھوٹی بہن نے اسے گلے سے لگایا۔ اس کو پیار کیا اور کہا: "باجی آپ اگر چاہیں تو میری زندگی سنور سکتی ہے۔"

"کیسے؟"

"مجھے حامد سے محبت ہے میں اس سے وعدہ کر چکی ہوں کہ اگر میری کہیں شادی ہوگی تو تمہیں سے ہوگی۔"

"تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"میں یہ چاہتی ہوں' کہ آپ اس معاملے میں میری مدد کریں۔ اگر وہاں سے پیغام آئے تو آپ اس کے حق میں گفتگو کیجئے امی اور ابا آپ کی ہر بات مانتے ہیں۔"

"میں انشاء اللہ تمہیں ناامید نہیں کروں گی۔"

ساجدہ کی شادی ہوگئی: حالانکہ اس کے والدین پہلے حامدہ کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ مجبور تھے کیا کرتے۔ ساجدہ اپنے گھر میں خوش تھی۔ اس نے اپنی بڑی بہن کو شادی کے دوسرے دن خط لکھا جس کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا:

"میں بہت خوش ہوں۔ حامد مجھ سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ باجی محبت عجیب وغریب چیز ہے میں بے حد مسرور ہوں۔ مجھے

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا صحیح مطلب اب میری سمجھ میں آیا ہے خدا کرے کہ آپ بھی اس مسرت سے محظوظ ہوں۔" اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں اس خط میں تھیں جو ایک بہن اپنی بہن کو لکھ سکتی ہے۔ حامدہ نے یہ پہلا خط پڑھا اور بہت روئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا ہر لفظ ایک ہتھوڑا ہے جو اس کے دل پر ضرب لگا رہا ہے۔

اس کے بعد اس کو اور بھی کئی خط آئے جن کو پڑھ پڑھ کے اس کے دل پر چھریاں چلتی رہیں رو رو کر اس نے اپنا برا حال کر لیا تھا اس نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ کوئی راہ چلتا جوان لڑکا اس کی طرف متوجہ ہو مگر ناکام رہی۔

اسے اس عرصے میں ایک ادھیڑ عمر کا مرد ملا۔ بس میں مڈبھیڑ ہوئی وہ اس سے مراسم قائم کرنا چاہتا تھا مگر حامدہ نے اسے پسند نہ کیا۔ وہ بہت بدصورت تھا۔

دو برس کے بعد اس کی بہن ساجدہ کا خط آیا کہ وہ اور اس کا خاوند آ رہے ہیں۔ وہ آئے۔ حامدہ نے مناسب و موزوں طریق پر ان کا خیر مقدم کیا۔ ساجدہ کے خاوند کو اپنے کاروبار کے سلسلے میں ایک ہفتے تک قیام کرنا تھا۔

ساجدہ سے مل کر اس کی بڑی بہن بہت خوش ہوئی۔ حامد بڑی خوش اخلاقی سے پیش آیا وہ اس سے بھی متاثر ہوئی۔

وہ گھر میں اکیلی تھی؛ اس لیے اس کے والدین کسی کام سے سرگودھا چلے گئے تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ حامدہ نے نوکروں سے کہا کہ وہ بستروں کا انتظام صحن میں کر دیں اور بڑا پنکھا لگا دیا جائے۔

یہ سب کچھ ہو گیا۔ لیکن ہوا یہ کہ ساجدہ کسی حاجت کے تحت اوپر کوٹھے پر گئی اور دیر تک وہیں رہی۔ حامد کوئی ارادہ کر چکا تھا۔ آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ اٹھ کر "ساجدہ" کے پاس گیا اور اس کے اوپر لیٹ گیا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ غیر سی کیوں لگتی ہے۔ کیونکہ وہ شروع شروع میں بے اعتنائی برتتی رہی آخر میں ٹھیک ہو گئی۔

ساجدہ کوٹھے سے اتر کر نیچے آئی اور اس نے دیکھا......

صبح کو دونوں بہنوں میں سخت لڑائی ہوئی۔ حامد بھی اس میں شامل تھا۔ اس نے گرمی میں کہا: تمہاری بہن میری بہن ہے۔ تم کیوں مجھ پر شک کرتی ہو۔"

حامد نے دوسرے روز اپنی ساجدہ کو طلاق دے دی اور دو تین مہینوں کے بعد حامدہ سے شادی کر لی اس نے اپنے ایک دوست سے جس کو اس پر اعتراض تھا صرف اتنا کہا: "خوبصورتی میں خلوص ہونا ناممکن ہے۔ بدصورتی ہمیشہ پرخلوص ہوتی ہے۔



مس مالا

گانے لکھنے والا عظیم گوبند پوری جب اے بی سی پروڈکشنز میں ملازم ہوا تو اس نے فوراً اپنے دوست میوزک ڈائریکٹر بھٹساوے کے متعلق سوچا جو مرہٹہ تھا اور عظیم کے ساتھ کئی فلموں میں کام کر چکا تھا۔ عظیم اس کی اہلیتوں کو جانتا تھا۔ سٹنٹ فلموں میں آدمی اپنے جوہر کیا دکھا سکتا ہے؛ بے چارہ گمنامی کے گوشے میں پڑا تھا۔

عظیم نے چنانچہ اپنے سیٹھ سے بات کی اور کچھ اس انداز میں کی کہ اس نے بھٹساوے کو بلایا اور اس کے ساتھ ایک فلم کا کنٹریکٹ تین ہزار روپوں میں کر لیا۔ کنٹریکٹ پر دستخط کرتے ہی اسے پانچ سو روپے ملے جو اس نے قرض خواہوں کو ادا کر دیے۔ عظیم گوبند پوری کا وہ بڑا شکر گزار تھا۔ چاہتا تھا کہ اس کی کوئی خدمت کرے مگر اس نے سوچا آدمی بے حد شریف ہے اور بے غرض۔ کوئی بات نہیں آئندہ مہینے سہی۔ کیونکہ ہر ماہ اسے پانچ سو روپے کنٹریکٹ کی رو سے ملنے تھے۔ اس نے عظیم سے کچھ نہ کہا۔ دونوں اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔ عظیم نے دس گانے لکھے جن میں سے سیٹھ نے چار پسند کیے۔ بھٹساوے نے موسیقی کے لحاظ سے صرف دو۔ ان کی اس نے عظیم کے اشتراک سے دھنیں تیار کیں جو بہت پسند کی گئیں۔

پندرہ بیس روز تک ریہرسلیں ہوتی رہیں۔ فلم کا پہلا گانا کورس تھا۔ اس کے لیے کم از کم دس گیارہ لڑکیاں درکار تھیں۔ پروڈکشن منیجر سے کہا گیا۔ مگر جب وہ انتظام نہ کر سکا تو بھٹساوے نے مس مالا کو بلایا جس کی اچھی آواز تھی۔ اس کے علاوہ وہ پانچ چھ اور لڑکیوں کو جانتی تھی جو سر میں گا لیتی تھیں۔ مس مالا کھانڈیکر جیسا کہ اس کا نام سے ظاہر کولہاپور کی مرہٹہ تھی۔ دوسروں کے مقابلہ میں اس کا اردو کا تلفظ زیادہ صاف تھا۔ اس کو یہ زبان بولنے کا شوق تھا۔ عمر کی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ لیکن اس کے چہرے کا ہر خدوخال اپنی جگہ پر پختہ۔ باتیں بھی اس انداز میں کرتی کہ معلوم ہوتا اچھی خاصی عمر کی ہے؛ زندگی کے اتار چڑھاؤ سے باخبر ہے۔ اسٹوڈیو کے ہر کارکن کو اپنا بھائی جان کہتی اور ہر آنے والے سے بہت جلد گھل مل جاتی۔ اس کو بھٹساوے نے بلایا تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اس کے ذمے یہ کام سپرد کیا گیا وہ فوراً کورس کے لیے دس گانے والی لڑکیاں مہیا کر دے۔ وہ دوسرے روز ہی دس بارہ لڑکیاں لے آئی۔ بھٹساوے نے ان کا ٹسٹ لیا۔ سات کام کی نکلیں۔ باقی رخصت کر دی گئیں۔ اس نے سوچا کہ چلو ٹھیک ہے؛ سات ہی کافی ہیں۔

جگناپ ساؤنڈ ریکارڈسٹ سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا میں سب ٹھیک کرلوں گا۔ ایسا معلوم ہوگا کہ بیس لڑکیاں گا رہی ہیں۔

جگناپ اپنے فن کو سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے ریکارڈنگ کے لیے ساؤنڈ پروف کمرے کے بجائے سازندوں اور گانے والیوں کو ایک ایسے کمرے میں بٹھایا جس کی دیواریں سخت تھیں۔ جن پر ایسا کوئی غلاف نہیں چڑھا ہوا تھا کہ آواز دب جائے۔ فلم "بے وفا" مہورت اسی کورس سے ہوا۔ سینکڑوں آدمی آئے۔ ان میں بڑے بڑے فلمی سیٹھ اور ڈسٹری بیوٹر تھے۔

اے بی سی پروڈکشنز کے مالک نے بڑا اہتمام کیا ہوا تھا۔

پہلے گانے کی دو چار ریہرسلیں ہوئیں۔ مس مالا کھانڈیکر نے بھنساوے کے ساتھ پورا تعاون کیا۔ سات لڑکیوں کو فرداً فرداً آگاہ کیا کہ خبردار رہیں اور کوئی نقص پیدا نہ ہونے دیں۔ بھنساوے پہلی ہی ریہرسل سے مطمئن تھا لیکن اس نے مزید اطمینان کی خاطر چند اور ریہرسلیں کرائیں۔ اس کے بعد جگناپ سے کہا کہ وہ اطمینان کرلے۔ اس نے جب ساؤنڈ ٹریک میں یہ کورس پہلی مرتبہ ہیڈفون لگا کر سنا تو اس نے خوش ہوکر بہت اونچا "اوکے" کہہ دیا۔ ہر ساز اور ہر آواز اپنے صحیح مقام پر تھی۔

مہمانوں کے لیے مائیکروفون کا بندوبست کر دیا تھا۔ ریکارڈنگ شروع ہوئی تو اسے اون کر دیا گیا۔ بھنساوے کی آواز بھونپو سے نکلی "سونگ نمبر ایک۔ ٹیک فرسٹ۔ ریڈی ون ٹو۔" اور کورس شروع ہوگیا۔

بہت اچھی کمپوزیشن تھی۔ سات لڑکیوں میں سے کسی ایک نے بھی غلط سر نہ لگایا۔ مہمان بہت محظوظ ہوئے۔ سیٹھ جو موسیقی کیا ہوتی ہے اس سے بھی قطعاً آشنا نہ تھا' بہت خوش ہوا۔ اس لیے کہ سارے مہمان اس کورس کی تعریف کر رہے تھے۔ بھنساوے نے سازندوں کو اور گانے والیوں کو شاباشیاں دیں۔ خاص طور پر اس نے مس مالا کا شکریہ ادا کیا جس نے اس کو اتنی جلدی گانے والیاں فراہم کردیں۔ اس کے بعد وہ جگناپ ساؤنڈ ریکارڈسٹ سے گلے مل رہا تھا۔ کہ اے بی سی پروڈکشنز کے مالک سیٹھ رنچھوڑ داس کا آدمی آیا کہ وہ اسے بلا رہے ہیں۔ عظیم گوبند پوری کو بھی۔

دونوں بھاگے' اسٹوڈیو کے اس جگہ جہاں محفل جمی ہوئی تھی۔ سیٹھ صاحب نے سب مہمانوں کے سامنے ایک سو روپے کا سبز نوٹ بھنساوے کو دیا پھر دوسرا عظیم گوبند پوری کو۔ وہ مختصر سا باغیچہ جہاں مہمان بیٹھے تھے' تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ جب مہورت کی یہ محفل برخواست ہوئی تو بھنساوے نے عظیم سے کہا: "مال پانی ہے' چلو آؤٹ ڈور چلیں!"

عظیم اس کا مطلب نہ سمجھا: "آؤٹ ڈور کہاں ہے؟"

بھنساوے مسکرایا: "ماڑے ملگے (میرے لڑکے) موزشوک (موج شوق) کرنے جائیں گے۔ سو روپیہ تمہارے پاس ہے'

سو ہمارے پاس۔ چلو؟"

عظیم سمجھ گیا۔ لیکن وہ اس کے موزشوک (موج شوق) سے ڈرتا تھا اس کی بیوی تھی' دو چھوٹے بچے تھے۔ اس نے کبھی عیاشی نہیں کی تھی۔ مگر اس وقت وہ خوش تھا۔ اس نے اپنے دل سے کہا۔ "چلو رے دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔"

بھنساوے نے فوراً ٹیکسی منگوائی۔ دونوں اس میں بیٹھ کر گرانٹ روڈ پہنچے۔ عظیم نے پوچھا: "ہم کہاں جا رہے ہیں' بھنساوے!" وہ مسکرایا: "اپنی موسی کے گھر۔" اور جب وہ اپنی موسی کے گھر پہنچے تو مس مالا کھانڈیکر کا گھر تھا۔ وہ ان دونوں سے بڑے تپاک کے ساتھ ملی۔ انہیں اندر اپنے کمرے میں لے گئی۔ ہوٹل سے چائے منگوا کر پی۔ بھنساوے نے اس سے چائے پینے کے بعد کہا: "ہم موزشوک کے لیے نکلے ہیں تمہارے پاس۔ تم ہمارا کوئی بندوبست کرو۔

مالا سمجھ گئی وہ بھنساوے کی احسان مند تھی اس لیے اس نے فوراً مرہٹی زبان میں کہا میں ہر خدمت کے لیے تیار ہوں۔ دراصل بھنساوے' عظیم کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ اس نے اسے ملازمت دلوائی تھی۔ چنانچہ بھنساوے نے مالا سے کہا کی وہ ایک لڑکی مہیا کردے۔

مس مالا نے اپنا میک اپ جلدی جلدی ٹھیک کیا اور تیار ہوگئی۔ سب ٹیکسی میں بیٹھے۔ پہلے مس مالا پلے بیک سنگر شانتا کرن کے گھر گئی۔ مگر وہ کسی اور کے ساتھ باہر جا چکی تھی۔ پھر وہ انسویاں کے ہاں گئی لیکن وہ اس قابل نہیں تھی کہ اس کے ساتھ اس مہم پر جا سکے۔

مس مالا کو بہت افسوس ہوا کہ اسے دو جگہ ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس کو امید تھی کہ معاملہ ہو جائیگا۔ چنانچہ ٹیکسی گول پیٹھا کی طرف لپکی۔ وہاں کرشنا تھی۔ پندرہ سولہ برس کی گجراتی لڑکی۔ بڑی نرم و نازک سر میں گاتی تھی۔ مالا اس کے گھر میں داخل ہوئی اور چند لمحات کے بعد اس کو ساتھ لیکر باہر نکل آئی۔ بھنساوے کو اس نے ہاتھ جوڑ کر نمسکار کہا اور عظیم کو بھی۔ مالا نے ٹھیٹ دلالوں کے سے انداز میں عظیم کو آنکھ ماری گویا خاموش زبان سے اس سے کہا "یہ آپ کے لیے ہے"

بھنساوے نے اس پر نگاہوں ہی نگاہوں میں صاد کردیا۔ کرشنا' عظیم گوبند پوری کے پاس بیٹھ گئی۔ چونکہ اس کو مالا نے سب کچھ بتا دیا تھا' اس لیے وہ اس سے چہلیں کرنے لگی۔ عظیم لڑکیوں کا سا حجاب محسوس کر رہا تھا۔ بھنساوے کو اس کی طبیعت کا علم تھا' اس لیے اس نے ٹیکسی ایک بار کے سامنے ٹھہرائی۔ صرف عظیم کو اپنے ساتھ اندر لے گئی۔

نغمہ نگار نے صرف ایک دو مرتبہ پی تھی' وہ بھی کاروباری سلسلے میں' یہ بھی کاروباری سلسلہ تھا۔ چنانچہ اس نے بھنساوے کے

اصرار پر دو پیگ رم کے پیئے اور اس کو نشہ ہو گیا۔ بھنساوے نے ایک بوتل خرید کر اپنے پاس رکھ لی۔ اب وہ پھر ٹیکسی میں تھے۔

عظیم کو اس بات کا قطعاً علم نہیں تھا کہ اس کا دوست بھنساوے دو گلاس اور سوڈے کی بوتلیں بھی ساتھ لے آیا ہے۔

عظیم کو بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پلے بیک سنگر کرشنا کی ماں سے یہ کہہ آیا تھا جو کورس دن میں لیا گیا تھا' اس کے جتنے ٹیک تھے' سب خراب نکلے ہیں اس لیے رات کو پھر ریکارڈنگ ہو گی۔ اس کی ماں ویسے کرشنا کو باہر جانے کی اجازت کبھی نہ دیتی مگر جب بھنساوے نے کہا اسے اور روپے ملیں گے تو اس نے اپنی بیٹی سے کہا کہ جلدی جاؤ اور فارغ ہو کر سیدھی یہاں آؤ' وہاں اسٹوڈیو میں نہ بیٹھی رہنا۔

ٹیکسی ورلی پہنچی یعنی ساحل سمندر کے پاس۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں عیش پرست کسی نہ کسی عورت کو بغل میں دبائے آیا کرتے۔ ایک پہاڑی سی تھی' معلوم نہیں مصنوعی یا قدرتی۔ اس پر چڑھتے۔ کافی وسیع و عریض جگہ سطح مرتفع قسم کی جگہ تھی۔

اس میں لمبے فاصلوں پر بنچیں رکھی ہوئی تھیں جن پر صرف ایک ایک جوڑا بیٹھتا۔ سب کے درمیان ایک ان لکھا سمجھوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے معاملہ میں مخل نہ ہوں۔ بھنساوے نے جو عظیم کی دعوت کرنا چاہتا تھا' ورلی کی پہاڑی پر کرشنا کو اس کے سپرد کر دیا اور خود مالا کے ساتھ ٹہلتا ٹہلتا ایک جانب چلا گیا۔

عظیم اور بھنساوے میں ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ ہو گا۔ عظیم جس نے غیر عورت کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ محسوس کیا تھا: جب کرشنا کو اپنے ساتھ بیٹھے دیکھا تو اس کا ایمان متزلزل ہو گیا۔ کرشنا ٹھیٹ مرہٹی لڑکی تھی۔ سانولی سلونی۔ بڑی مضبوط۔ شدید طور پر جوان اور اس میں وہ تمام دعوتیں تھیں جو پرکشش کمل کھیلنے والی میں ہو سکتی ہیں۔ عظیم چونکہ نشے میں تھا اس لیے وہ اپنی بیوی کو بھول گیا اور اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کرشنا کو تھوڑے عرصے کے لیے اپنی بیوی بنا لے۔

اس کے دماغ میں مختلف شرارتیں پیدا ہو رہی تھیں۔ کچھ رم کے باعث اور کچھ کرشنا کی قربت کی وجہ سے۔ عام طور پر وہ بہت سنجیدہ رہتا تھا۔ بڑا کم گو۔ لیکن اس وقت اس نے کرشنا کے گدگدی کی۔ اس کو کئی لطیفے اپنی ٹوٹی پھوٹی گجراتی میں سنائے۔ پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ زور سے بھنساوے کو آواز دی اور کہا "پولیس آ رہی ہے۔ پولیس آ رہی ہے۔"

بھنساوے مالا کے ساتھ آیا۔ عظیم کو موٹی سی گالی دی اور ہنسنے لگا وہ سمجھ گیا کہ عظیم نے مذاق کیا ہے۔ لیکن اس نے سوچا بہتر یہی ہے کسی ہوٹل میں چلیں جہاں پولیس کا خطرہ نہ ہو۔ چاروں اٹھ رہے تھے کہ پیلی پگڑی والا نمودار ہوا۔ اس نے ٹھیٹ سپاہیانہ انداز میں پوچھا: "تم لوگ رات کے گیارہ بجے یہاں کیا کر رہا ہے؟" معلوم نہیں دس بجے کے بعد یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے؟ قانون

ہے!"

عظیم نے سنتری سے کہا: "جناب اپن فلم کا آدمی ہے۔"

"یہ چھوکری؟" اس نے کرشنا کی طرف دیکھا۔

"یہ بھی فلم میں کام کرتی ہے۔ ہم لوگ کسی برے خیال سے یہاں نہیں آئے۔ یہاں پاس ہی جو اسٹوڈیو ہے' اس میں کام کرتے ہیں۔ تھک جاتے ہیں تو یہاں چلے آتے ہیں کہ تھوڑی سی تفریح ہو گی۔ بارہ بجے ہماری شوٹنگ پھر شروع ہونے والی ہے۔"

پیلی پگڑی والا مطمئن ہو گیا۔ پھر وہ بھنساوے سے مخاطب ہوا: "تم ادھر کیوں بیٹھا ہے؟" بھنساوے پہلے گھبرایا لیکن سنبھل کر اس نے مالا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور سنتری سے کہا:

"یہ ہمارا وائف ہے۔ ہماری ٹیکسی نیچے کھڑی ہے"

تھوڑی سی اور گفتگو ہوئی اور چاروں کی خلاصی ہو گئی۔ اس کے بعد انہوں نے ٹیکسی میں بیٹھ کر سوچا کہ کسی ہوٹل میں چلیں۔ عظیم کو ایسے ہوٹلوں کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا جہاں آدمی چند گھنٹوں کے لیے کسی غیر عورت کے ساتھ خلوت اختیار کر سکے۔ بھنساوے نے بے کار اس سے مشورہ کیا۔ چنانچہ اس کو فوراً ڈیوک یارڈ کا سی ویو ہوٹل یاد آیا اور اس نے ٹیکسی والے سے کہا کہ وہاں چلو۔ سی ویو ہوٹل میں بھنساوے نے دو کمرے لیے۔ ایک میں عظیم اور کرشنا چلے گئے۔ دوسرے میں بھنساوے اور مس مالا کھانڈیکر۔

کرشنا بدستور مجسم دعوت تھی۔ لیکن عظیم جس نے دو پیگ اور پی لیے تھے' فلسفی رنگ اختیار کر چکا تھا۔ اس نے کرشنا کو غور سے دیکھا اور سوچا کہ اتنی کم عمر لڑکی نے گناہ کا یہ بھیانک رستہ کیوں اختیار کیا۔ خون کی کمی کے باوجود اس میں جنس کی اتنی ہمس کیوں ہے؟ کب تک یہ نرم و نازک لڑکی جو گوشت نہیں کھاتی' کب تک اپنا گوشت پوست بیچتی رہے گی۔ عظیم کو اس پر بڑا ترس آیا۔ چنانچہ اس نے واعظ بن کر اس سے کہنا شروع کیا: "کرشنا! مصیبت کی زندگی سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ خدا کے لیے جس راستہ پر تم گامزن ہو' اپنے قدم ہٹا لو۔ یہ تمہیں ایسے مہیب غار میں لے جائے گا جہاں سے تم نکل نہیں سکو گی۔ عصمت فروشی انسان کا بدترین فعل ہے۔ یہ رات اپنی زندگی کی روشن رات سمجھو۔ اس لیے میں نے تمہیں نیک و بد سمجھا دیا ہے۔" کرشنا نے اس کا جو مطلب سمجھا وہ یہ تھا کہ عظیم اس سے محبت کر رہا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے ساتھ چمٹ گئی اور عظیم اپنا گناہ و ثواب کا مسئلہ بھول گیا۔

بعد میں وہ بڑا نادم ہوا۔ کمرے سے باہر نکلا تو بھنساوے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ کچھ اس انداز کے ساتھ جیسے بھڑوں کے

پورے چھتے کے ڈنک اس کے جسم میں کھبے ہوئے ہیں۔ عظیم کو دیکھ کر رک گیا۔ مطمئن کرشا کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور پیچ وتاب کھا کر عظیم سے کہا: ''وہ سالی چلی گئی۔''

عظیم جو اپنی ندامت میں ڈوبا تھا' چونکا: ''کون؟''

''وہی۔مالا''

''کیوں؟''

بھنساوے کے لہجے میں عجیب وغریب احتجاج تھا: ''ہم اس کو اتنا وقت چوستے رہے۔ جب بولا آؤ۔ تو سالی کہنے لگا تم ہمارا بھائی ہے ہم نے کسی سے شادی کرلی ہے۔'' اور باہر نکل گئی۔

کہ وہ سالہ گھر میں آ گیا ہوگا۔



دودا پہلوان

اسکول میں پڑھتا تھا تو شہر کا حسین ترین لڑکا تھا۔ اس پر بڑے بڑے امرد پرستوں کے درمیان بڑی خونخوار لڑائیاں ہوئیں۔ ایک دو اسی سلسلے میں مارے گئے۔ وہ واقعی بڑا حسین تھا۔ بڑے مالدار گھرانے کا چشم وچراغ تھا اس لیے اس کو کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ مگر جس میدان میں وہ کود پڑا تھا اسے ایک محافظ کی ضرورت تھی جو وقت پر اس کے کام آ سکے۔ شہر میں یوں تو سینکڑوں بدمعاش اور غنڈے موجود تھے جو حسین وجمیل صلاحو کے ایک اشارے پر کٹ مرنے کو تیار تے مگر دودے پہلوان میں ایک نرالی بات تھی۔ وہ بہت مفلس' تھا بہت بدمزاج اور اکھڑ طبیعت کا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس میں ایسا بانکپن تھا کہ صلاحو نے اس کو دیکھتے ہی پسند کرلیا اور ان کی دوستی ہوگئی۔

صلاحو کو دودے پہلوان کی رفاقت سے بہت فائدے ہوئے۔ شہر کے دوسرے غنڈے جو صلاحو کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے کا موجب ہو سکتے تھے' دودے کی وجہ سے خاموش رہے۔ اسکول سے نکل کر صلاحو کالج میں داخل ہوا تو اس نے اور پر پرزے نکالے اور تھوڑے ہی عرصے میں اس کی سرگرمیاں نیا رخ اختیار کر گئیں۔ اس کے بعد خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ صلاحو کا باپ مر گیا۔ اب وہ اس کی تمام جائیداد املاک کا واحد مالک تھا۔ پہلے تو اس نے نقدی پر ہاتھ صاف کیا۔ پھر مکان گروی رکھنے شروع کئے جب دو مکان بک گئے تو ہیرا منڈی کی تمام طوائفیں صلاحو کے نام سے واقف تھیں۔ معلوم نہیں اس میں کہاں تک صداقت ہے لیکن لوگ کہتے ہیں کہ ہیرا منڈی میں بوڑھی نائکائیں جوان بیٹیوں کو صلاحو کی نظروں سے چھپا چھپا کر رکھتی تھیں مبادہ وہ اس حسن کے چکر میں پھنس جائیں۔ لیکن ان کی احتیاطی تدابیر کے باوجود جیسا کہ سننے میں آیا ہے کئی کنواری طوائف زادیاں اس کے عشق میں گرفتار ہوئیں اور الٹے رستے پر چل کر اپنی زندگی کے سنہرے ایام اس کے ٹکوں کی نذر کر بیٹھیں۔

صلاحو کھل کھیل رہا تھا۔ دودے کو معلوم تھا کہ یہ کھیل دیر تک جاری نہیں رہے گا۔ وہ عمر میں صلاحو سے دگنا بڑا تھا۔ اس نے ہیرا منڈی میں بڑے بڑے سیٹھوں کی خاک اڑتی دیکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ہیرا منڈی ایک ایسا اندھا کنواں ہے جس کو دنیا بھر کے سیٹھ مل کر بھی اپنی دولت سے نہیں بھر سکتے۔ مگر وہ اس کو کوئی نصیحت نہیں دیتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ جہاندیدہ ہونے کے باعث اچھی

طرح سمجھتا تھا کہ جو بھوت اس کے حسین وجمیل بابو کے سر پر سوار ہے' اسے کوئی ٹونا ٹوٹکا اتار نہیں سکتا۔

دودا پہلوان ہر وقت صلاحو کے ساتھ ہوتا تھا۔ شروع شروع میں جب صلاحو نے ہیرا منڈی کا رخ کیا تو اس کا خیال تھا کہ دودا بھی اس کے عیش میں شریک ہوگا مگر آہستہ آہستہ اسے معلوم ہوا کہ اس کو اس قسم کے عیش سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جس میں وہ دن رات غرق رہتا تھا۔ وہ گانا سنتا تھا' شراب پیتا تھا۔ طوائفوں سے فحش مزاق بھی کرتا تھا' مگر اس سے آگے کبھی نہیں گیا تھا۔ اس کا بابو رات بھر اندر کسی معشوق کو بغل میں دبائے پڑا رہتا اور وہ باہر کسی پہرے دار کی طرح جاگتا رہتا۔

لوگ سمجھتے تھے کہ دودے نے اپنا گھر بھر لیا ہے۔ دولت کی لوٹ مچی ہے۔ اس میں اس نے یقیناً اپنے ہاتھ رنگے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب صلاحو داد عیش کرنے کو نکلتا تھا تو ہزاروں روپے کے نوٹ دودے ہی کی تحویل میں ہوتے تھے۔ مگر یہ صرف اسی کو معلوم تھا کہ پہلوان نے ان میں سے ایک پائی بھی کبھی ادھر ادھر نہیں کی۔ اس کو صرف صلاحو سے دلچسپی تھی جس کو وہ اپنا آقا سمجھتا تھا اور یہ لوگ بھی جانتے تھے کہ دودا کس حد تک اس کا غلام ہے۔ صلاحو اس کو ڈانٹ ڈپٹ لیتا تھا۔ بعض اوقات شراب کے نشے میں اسے مار پیٹ بھی لیتا تھا مگر وہ خاموش رہتا۔ حسین وجمیل صلاحو اس کا معبود تھا وہ اس کے حضور کوئی گستاخی نہیں کر سکتا تھا۔

ایک دن اتفاق سے دودا بیمار تھا۔ صلاحو رات کو حسب معمول عیش کرنے کے لیے ہیرا منڈی پہنچا۔ وہاں کسی طوائف کے کوٹھے پر گانا سننے کے دوران میں اس کی جھڑپ ایک تماش بین سے ہوگئی اور ہاتھا پائی میں اس کے ماتھے پر ہلکی سی خراش آگئی۔ دودے کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے دیوار کے ساتھ ٹکریں مار مار کر اپنا سارا سر زخمی کر لیا۔ خود کو بے شمار گالیاں دیں۔ بہت برا بھلا کہا۔ اس کو اتنا افسوس ہوا کہ دس پندرہ دن تک صلاحو کے سامنے اس کا سر جھکا رہا۔ ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہ نکلا۔ اس کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس سے کوئی بہت بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ چنانچہ لوگوں کا بیان ہے کہ وہ بہت دیر دیر نمازیں پڑھ پڑھ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتا رہا۔

صلاحو کی وہ اس طرح خدمت کرتا تھا جس طرح پرانے قصے کہانیوں کے وفادار نوکر کرتے ہیں۔ وہ اس کے جوتے پالش کرتا تھا۔ اس کے پاؤں دباتا تھا۔ اس کے چکیلے بدن پر مالش کرتا تھا۔ اس کے آرام اور آسائش کا خیال رکھتا تھا۔ لگتا تھا جیسے اس کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔

کبھی صلاحو ناراض ہو جاتا۔ یہ وقت دودے پہلوان کے لیے بڑی آزمائش کا وقت ہوتا تھا۔ دنیا سے بیزار ہو جاتا۔ فقیروں

کے پاس جا کر تعویز گنڈے لیتا۔ خود کو طرح طرح کی جسمانی تکلیف پہنچاتا۔ آخر جب صلاحو موج میں آ کر اسے بلاتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ دونوں جہان مل گئے ہیں دودے کو اپنی طاقت پر ناز نہیں تھا اسے یہ گھمنڈ نہیں تھا کہ وہ چھری مارنے کے فن میں یکتا ہے۔ اس کو اپنی ایمانداری اور اپنے خلوص پر بھی کوئی فخر نہیں تھا۔ لیکن وہ اپنی اس بات پر بہت نازاں تھا کہ لنگوٹ کا پکا ہے۔ وہ اپنے دوستوں یاروں کو بڑے فخر و انبساط سے بتایا کرتا تھا کہ اس کی جوانی میں سینکڑوں مرد مار عورتیں آئیں' چلتروں کے بڑے بڑے منتر اس پر پھونکے مگر وہ شاباش ہے اس کے استاد کو لنگوٹ کا پکا رہا۔

یہ بڑ نہیں تھی۔ ان لوگوں کو جو دودے پہلوان کے لنگوٹیے تھے' اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کا دامن عورت کی تمام آلائشوں سے پاک ہے متعدد بار کوشش کی گئی کہ وہ گمراہ ہو جائے مگر ناکامی ہوئی۔ وہ ثابت قدم رہا۔

خود صلاحو نے کئی بار اس کا امتحان لیا۔ اجمیر کے عرس پر اس نے میرٹھ کی ایک کافر ادا طوائف انوری کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ دودے پہلوان پر ڈورے ڈالے۔ اس نے اپنے تمام گر استعمال کر ڈالے مگر دودے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ عرس ختم ہونے پر جب وہ لاہور روانہ ہوئے تو گاڑی میں اس نے صلاحو سے کہا: "باؤ! بس اب میرا کوئی اور امتحان نہ لینا۔ یہ سالی انوری بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ تمہارا خیال تھا ورنہ گلا گھونٹ دیتا حرامزادی کا۔"

اس کے بعد صلاحو نے اس کا اور کوئی امتحان نہ لیا۔ دودے کے یہ تنبیہی الفاظ کافی سنگین لہجے میں ادا کئے تھے۔

صلاحو عیش و عشرت میں بدستور غرق تھا۔ اس لیے کہ ابھی تین چار مکان باقی تھے۔ ہیرا منڈی کی تمام قابل ذکر طوائفیں ایک ایک کر کے اس کے پہلو میں آ چکی تھیں۔ اب اس نے چھوٹے جاموں کا دور شروع کر دیا تھا۔ اسی دوران میں ایک دم جانے کہاں سے ایک طوائف الماس پیدا ہو گئی جو ایک دم ساری ہیرا منڈی پر چھا گئی۔ دیکھا کسی نے بھی نہیں تھا مگر اس کے باوجود اس کے حسن کے چرچے عام تھے۔ ہاتھ لگائے میلی ہوتی ہے۔ پانی پیتی ہے تو اس کے شفاف حلق میں سے نظر آتا ہے۔ ہرنی کی سی آنکھیں ہیں جن میں خدا نے اپنے ہاتھ سے سرمہ لگایا ہے۔ بدن ایسا ملائم ہے کہ نگاہیں پھسل پھسل جاتی ہیں۔ صلاحو جہاں بھی جاتا تھا اس پری چہرہ اور حور شمائل معشوق کے حسن جمال کی باتیں سنتا تھا۔

دودے پہلوان نے فوراً پتہ لگایا اور اپنے بابو کو بتایا کہ یہ الماس کشمیر سے آئی ہے۔ واقعی خوبصورت ہے ادھیڑ عمر کی ماں اس کے ساتھ ہے جو اس پر بہت کڑی نگرانی رکھتی ہے۔ اس لیے کہ لاکھوں کے خواب دیکھ رہی ہے۔

جب الماس کا مجرا شروع ہوا تو اس کے کوٹھے پر صرف وہی صاحب ثروت جاتے تھے جن کا لاکھوں کا کاروبار تھا۔ صلاحو کے

پاس اب اتنی دولت نہیں رہی تھی کہ وہ ان بگڑے دولت مند عیاشوں کا مقابلہ خم ٹھونک کر سک آٹھ دس مجروں ہی میں اس کی حجامت ہو جاتی۔ چنانچہ وہ اسی خیال کے تحت خاموش رہا اور پیچ و تاب کھاتا رہا۔ دودا پہلوان اپنے بابو کی یہ بے چارگی دیکھتا تو اسے بہت دکھ ہوتا۔ مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ اس کے پاس تھا ہی کیا۔ ایک صرف اس کی جان تھی مگر وہ اس معاملے میں کیا کام دے سکتی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد آخر دودے نے ایک ترکیب سوچی جو یہ تھی کہ صلاحو الماس کی ماں اقبال سے رابطہ پیدا کرے۔ اس پر یہ ظاہر کرے کہ وہ اس کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اس طرح جب موقع ملے تو الماس کو اپنے قبضے میں کر لے۔

صلاحو کو یہ ترکیب پسند آئی۔ چنانچہ فوراً اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ اقبال بہت خوش ہوئی کہ اس ڈھلتی عمر میں اسے صلاحو جیسا خوبرو چاہنے والا مل گیا۔ یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ اس دوران میں سینکڑوں مرتبہ الماس صلاحو کے سامنے آئی۔ بعض اوقات اس کے پاس بیٹھ کر باتیں بھی کرتی رہی اور اس کے حسن سے کافی متاثر ہوئی۔ اس کو حیرت تھی کہ وہ اس کی ماں سے کیوں دلچسپی لے رہا ہے جب کہ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ لیکن اس کی یہ حیرت بہت دیر تک قائم نہ رہی۔ جب اس کو صلاحو کی حرکات و سکنات سے معلوم ہو گیا کہ وہ چال چل رہا ہے' اس انکشاف سے اسے خوشی ہوئی۔ اندرونی طور پر اس کے احساس جوانی کو بڑی ٹھیس پہنچ رہی تھی۔

باتوں باتوں میں ایک دن صلاحو کا ذکر آیا تو الماس نے اس کی خوبصورتی کی تعریف ذرا چٹخارے کے ساتھ بیان کی جو اس کی ماں اقبال کو بہت ناگوار معلوم ہوئی۔ چنانچہ ان دونوں میں خوب چخ ہوئی۔ الماس نے اپنی ماں سے صاف صاف کہہ دیا کہ صلاحو اسے بیوقوف بنا رہا ہے۔ اقبال کو بہت دکھ ہوا۔ یہاں اب بیٹی کا سوال نہیں تھا۔ بلکہ رقیب کا یا موت کا۔ چنانچہ دوسرے روز جب صلاحو آیا تو اس نے سب سے پہلے اس سے پوچھا: "آپ کسے پسند کرتے ہیں مجھے یا میری بیٹی الماس کو؟"

صلاحو عجیب مخمصے میں گرفتار ہو گیا۔ سوال بڑا ٹیڑھا تھا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اس کو بالآخر یہی کہنا پڑا۔ "تمہیں...... میں تو صرف تمہیں سے پیار کرتا ہوں۔" اور پھر اسے اقبال کو مزید یقین دلانے کے لیے اور بہت سی باتیں گھڑنا پڑیں۔ اقبال یوں تو بڑی چالاک تھی مگر اس کو کسی حد تک یقین آ ہی گیا۔ شاید اس لیے کہ وہ اپنی عمر کے ایسے موڑ پر پہنچ چکی تھی جہاں اسے چند جھوٹی باتوں کو بھی سچا سمجھنا ہی پڑا تھا۔

جب یہ بات الماس کو پہنچی تو وہ بہت جز بز ہوئی۔ جونہی اسے موقع ملا اس نے صلاحو کو پکڑ لیا اور اس سے سچ اگلوانے کی کوشش کی۔ صلاحو زیادہ دیر تک اس کی جرح برداشت نہ کر سکا۔ آخر اسے ماننا ہی پڑا کہ اسے اقبال سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اصل میں تو

الماس کا حصول ہی یہ قبولوانے پر الماس کی تسلی ہو گئی' مگر وہ لگاؤ جو اس کے دل و دماغ میں صلاحو کے متعلق پیدا تھا غائب ہو گیا اور اس نے خبیث طوائف بن کر اپنی ماں کو سمجھایا کہ پیچھا چھوڑ و اور اس سے میرے دام وصول کرو' تمہیں وہ کیا دے گا۔ اپنی لڑکی یہ عقل والی بات اقبال کی سمجھ میں آ گئی اور وہ صلاحو کو دوسری نظر سے دیکھنے لگی۔

صلاحو بھی سمجھ گیا کہ اس کا وار خالی گیا ہے۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ نیلام میں الماس کی سب سے بڑھ کر بولی دے۔ دودے پہلوان نے ادھر ادھر سے کرید کر معلوم کیا کہ الماس کی نتھنی اتر سکتی ہے اگر صلاحو پچیس ہزار روپے اس کی ماں کے قدموں میں ڈھیر کر دے۔

صلاحو پوری طرح جکڑا جا چکا تھا۔ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا معاملہ تھا۔ اس نے دو مکان بیچے اور پچیس ہزار روپے حاصل کر کے اقبال کے پاس پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اتنی رقم پیدا نہیں کر سکے گا۔ جب وہ لے آیا تو وہ بوکھلا سی گئی۔ الماس سے مشورہ کیا تو اس کہا کہ اتنی جلدی کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ پہلے اس کو کہو کہ ہمارے ساتھ کلیر شریف عرس پر چلے۔ صلاحو کو جانا پڑا اور نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ پورے پندرہ ہزار روپے مجرہ میں اڑ گئے۔ اس کی ان تماش بینوں پر جو عرس میں شریک ہوئے تھے دھاک تو بیٹھ گئی مگر اس کے پچیس ہزار کو دیمک لگ گئی۔ واپس آئے تو باقی کا روپیہ آہستہ آہستہ الماس کی فرمائشوں کی نذر ہو گیا۔ دودا اندر ہی اندر سے غصے سے کھول رہا تھا۔ اس کے دل میں بہت سی باتیں تھیں جو صلاحو کو بتانا چاہتا تھا۔ مگر بتا نہیں سکتا تھا۔ اس سے اسے اور بھی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ صلاحو بہت بری طرح الماس پر لٹو تھا۔ پچیس ہزار روپے ٹھکانے لگ چکے تھے۔ اب وہ دس ہزار روپے اس مکان کو گروی رکھ کر اجاڑ رہا تھا جس میں اس کی نیک سیرت ماں رہتی تھی۔ یہ روپیہ کب تک اس کا ساتھ دیتا۔ اقبال اور الماس دونوں جونک کی طرح چمٹی ہوئی تھیں۔ آخر وہ دن بھی آ گیا جب اس پر نالش ہوئی اور عدالت نے قرقی کا حکم دے دیا۔

صلاحو بہت پریشان ہوا اسے کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ کوئی ایسا آدمی نہیں تھا جو اسے قرض دیتا۔ لے دے ایک مکان تھا سو وہ بھی گروی تھا اور قرقی آئی تھی اور بیلف صرف دودے پہلوان کی وجہ سے رکے ہوئے تھے جس نے ان کو یقین دلایا تھا کہ وہ بہت جلد روپے کا بندوبست کر دے گا۔

صلاحو بہت ہنسا تھا دودا کہاں سے روپے کا بندوبست کرے گا۔ سو دو سو روپے کی بات ہوتی تو اسے یقین آ جاتا۔ مگر سوال پورے دس ہزار روپے کا تھا۔ چنانچہ اس نے پہلوان کا بڑی بے دردی سے مذاق اڑایا تھا کہ وہ اس کو طفل تسلیاں دے رہا ہے۔ پہلوان نے یہ لعن طعن خاموشی سے برداشت کی اور چلا گیا۔ دوسرے روز آیا تو اس کا شگرف ایسا چہرہ زرد تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ

بستر علالت پر سے اٹھ کر آیا ہے۔ سر نیوڑھا کر اس نے ڈب میں سے رومال نکالا جس میں سو سو کے کئی نوٹ تھے اور صلاحو سے کہا: لے باؤ لے آیا ہوں۔"

صلاحو نے نوٹ گنے پورے دس ہزار تھے۔ ٹکر ٹکر پہلوان کا منہ دیکھنے لگا۔

"یہ روپیہ کہاں سے پیدا کیا تم نے؟"

دودے نے افسردہ لہجے میں جواب دیا: "ہو گیا کہیں سے پیدا۔"

صلاحو قرقی کو بھول گیا۔ اتنے سارے روپے دیکھے تو اس کے قدم پھر الماس کے کوٹھے کی طرف اٹھنے لگے مگر پہلوان نے اسے روکا۔

"نہیں باؤ الماس کے پاس نہ جاؤ یہ روپیہ قرقی والوں کو دو۔"

صلاحو طیش میں آ گیا: "تو کون ہوتا ہے مجھے روکنے والا!"

دودے کی آواز نرم ہو گئی۔ "میں تمہارا غلام ہوں باؤ پر اب الماس کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

دودے کی آواز میں لرزش پیدا ہو گئی: "نہ پوچھ باؤ۔ یہ روپیہ مجھے اسی نے دیا ہے۔"

صلاحو قریب قریب چیخ اٹھا: "یہ روپیہ الماس نے دیا ہے تمہیں دیا ہے؟"

"ہاں باؤ اسی نے دیا ہے۔ مجھ پر بہت دیر سے مرتی تھی سالی پر میں اس کے ہاتھ نہیں آتا تھا۔ تجھ پر تکلیف کا وقت آیا تو میرے دل نے کہا دودے چھوڑ اپنی قسم کو۔ تیرا باؤ تجھ سے قربانی مانگتا ہے۔ سو میں کل رات اس کے پاس گیا اور....... اور .... اور اس سے یہ سودا کر لیا۔"

دودے کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔



مسٹر معین الدین

منہ سے کبھی جدا نہ ہونے والا سگار ایش ٹرے میں پڑا ہلکا ہلکا دھواں دے رہا تھا۔ پاس ہی مسٹر معین الدین آرام کرسی پر بیٹھے ایک ہاتھ اپنے چوڑے ماتھے پر رکھے کچھ سوچ رہے تھے! حالانکہ وہ اس کے عادی نہیں تھے۔ آمدن معقول تھی۔ کراچی شہر میں ان کی موٹروں کی دکان سب سے بڑی تھی۔ اس کے علاوہ سوسائٹی کے اونچے حلقوں میں ان کا بڑا نام تھا۔ کئی کلبوں کے ممبر تھے۔ بڑی بڑی پارٹیوں میں ان کی شرکت ضروری سمجھی جاتی تھی۔ صاحب اولاد تھے۔ لڑکا انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ لڑکی بہت کم سن تھی لیکن بڑی ذہین تھی اور خوبصورت۔ وہ اس طرف سے بھی بالکل مطمئن تھے۔ لیکن اپنی بیوی۔ مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مسٹر معین الدین کی شادی کے متعلق چند باتیں بتا دی جائیں۔

مسٹر معین الدین کے والد بمبئی ہی میں مقیم ہو گئے تھے۔ یوں تو وہ رہنے والے لاہور کے تھے مگر کاروباری سلسلے کے باعث بمبئی ہی میں مقیم ہو گئے تھے۔ اور یہی ان کا وطن بن گیا تھا۔ معین الدین جوان کا اکلوتا لڑکا تھا بظاہر عاشق مزاج نہیں تھا لیکن معلوم نہیں وہ کیسے اور کیونکر آدم جی باٹلی والا کی موٹی موٹی لافانی آنکھوں والی لڑکی پر فریفتہ ہو گیا۔ لڑکی کا نام زہرہ تھا معین سے محبت کرتی تھی۔ مگر شادی میں کئی مشکلات حائل تھیں۔ آدم جی باٹلی والا جو معین کے والد کا پڑوسی اور دوست بھی تھا بڑے پرانے خیالات کا بوہرا تھا۔ وہ اپنی لڑکی کی شادی اپنے ہی فرقے میں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ زہرہ اور معین کا معاشقہ بہت دیر تک بے نتیجہ چلتا رہا۔ اس دوران میں معین کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ماں بہت پہلے مر چکی تھی۔ اب کاروبار کا سارا بوجھ معین کے کندھوں پر آن پڑا جس سے اس کی کوئی رغبت نہیں تھی ادھر زہرہ کی محبت بھی تھی جو کسی حیلے بارآور ثابت ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ پھر ہندو مسلم فسادات تھے۔ معین ایک عجیب گڑبڑ میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ بے سوچے سمجھے ایک دن اس نے فیصلہ کیا کہ اپنا کاروبار سمیٹ کر اس کو کسی اچھے گاہک کے پاس بیچ ڈالے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور اپنا سارا روپیہ کراچی کے بنک میں جمع کرا دیا اور زہرا سے مل کر اس نے اپنے ارادے کا اظہار کیا کہ وہ بمبئی چھوڑ کر کراچی جانا چاہتا ہے مگر اکیلا نہیں زہرہ اس کے ساتھ ہو گی۔ زہرہ فوراً مان گئی۔ ایک ہفتے کے بعد دونوں میاں بیوی بن کر کراچی کے ایک خوبصورت ہوٹل میں

تھے۔ بمبئی میں زہرہ کے والدین پر کیا گزری اس کا انہیں کچھ علم نہیں تھا اور نہ انہیں اس کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ دونوں اپنی محبت کی پیاس بجھانے میں مگن تھے۔ ان کو اس اہم حادثے کی بھی خبر نہیں تھی کہ ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔

بہر حال جب لاکھوں انسانوں کا خون فرقہ وارانہ فسادات میں پانی کی طرح بہ گیا اور کراچی میں پاکستان کے قیام کی خوشی میں چراغاں ہوا تو مسٹر معین اور مسز معین کو معلوم ہوا کہ وہ پاکستان میں ہیں۔ اور مسٹر آدم بھائی باٹلی والا اور مسز آدم بھائی باٹلی والا ہندوستان میں۔ وہ بہت خوش ہوئے کہ اب وہ محفوظ تھے۔ جب افراط و تفریط کا عالم کسی قدر کم ہوا تو مسٹر معین نے اپنے بمبئی کے کاروبار کے حوالے سے ایک بہت بڑی دکان اپنے نام الاٹ کرالی اور اس میں موٹروں کا کاروبار شروع کر دیا جو چند برسوں میں چل نکلا۔ اس دوران میں ان کے یہاں دو بچے پیدا ہوئے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکا جب چار برس کا ہوا تو انہوں نے اس کو اپنے ایک دوست کے حوالے کر دیا جو انگلستان جا رہا تھا۔ مسٹر معین چاہتے تھے کہ اس کی تربیت وہیں ہو کیونکہ کراچی کی فضا ان کے نزدیک بڑی گندی تھی۔ لڑکی جو اپنے بھائی سے ایک برس چھوٹی تھی' گھر ہی میں کھیلتی کودتی رہتی۔ اس کے لیے مسٹر معین نے ایک انگریز نرس مقرر کر رکھی تھی۔ اس بات پر زیادہ زور دینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ مسٹر معین کو اپنی بیوی سے بے پناہ محبت تھی۔ طبعاً وہ کم گو اور شریف طبیعت تھے۔ وہ زہرہ سے جب اپنی محبت کا اظہار کرتے تو بڑے مدہم سروں میں۔ بڑے وضع دار قسم کے آدمی تھے۔ کلبوں میں جاتے' زہرہ ان کے ساتھ ہوتی مگر وہ دوسرے ممبروں کی طرح بے وجہ فنی قہقہوں میں کبھی شامل نہ ہوتے۔ وسکی کے دو پیگ آہستہ آہستہ پیتے جیسے کوئی قرض ادا کر رہے ہیں۔ ناچ شروع ہوتا تو زہرہ کے ساتھ تھوڑی دیر ناچ کر گھر واپس چلے آتے جو انہوں نے ایک ہندو سے کراچی آنے کے بعد خرید لیا تھا۔

زہرہ کبھی کبھی اپنے خاوند کی اجازت سے دوسروں کے ساتھ بھی ناچ لیتی تھی۔ اس میں مسٹر معین کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ زہرہ ان کے دوست مسٹر احسن سے جو ادھیڑ عمر کے بہت بڑے مالدار تاجر تھے ضرورت سے زیادہ التفات برت رہی ہیں تو ان کو بڑی الجھن ہوئی مگر انہوں نے زہرہ پر اس کا اظہار کبھی نہ کیا۔ کیونکہ وہ سوچتے تھے کہ احسن اور زہرہ میں عمر کا اتنا تفاوت ہے۔ پھر وہ دو بچوں کی ماں ہے۔ یہ صرف رقابت کا جذبہ ہے جو ان کی اندھی محبت کی پیداوار ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے کہ سوسائٹی کے جن اونچے حلقوں میں ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا اس میں بیویوں سے غیر مردوں کے التفات کو بری نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا بلکہ اسے فیشن سمجھا جاتا تھا کہ ایک کی بیوی کسی دوسرے آدمی کے ساتھ ناچے اور اس کی بیوی پہلے

کے شوہر کے ساتھ ایسی بدلا بدلی عام تھی۔

پہلے مسٹر احسن گاہے گاہے جب کوئی پارٹی دی گئی ہو مسٹر معین کے پاس آیا کرتے تھے مگر کچھ عرصے سے ان کا باقاعدہ آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ ان کی غیر حاضری میں بھی وہ آ جاتے اور گھنٹوں زہرہ کے پاس بیٹھے رہتے یہ انہیں اپنے ملازموں سے معلوم ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے زہرہ سے کچھ نہ کہا۔ دراصل ان کی زبان پر ایسے لفظ آتے ہی نہیں تھے جن سے وہ شکوک کا اظہار کریں۔ وہ مجبور تھے۔ اس لیے ان کی پرورش ہی ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں ایسے معاملوں میں لب کشائی معیوب خیال کی جاتی ہے۔ روشن خیالی کا تقاضا یہی تھا کہ وہ خاموش رہیں۔

یوں تو انہوں نے ایک بڑے معرکے کا عشق کیا تھا مگر دماغ ان کا تاجرانہ تھا۔ دل اور دماغ میں کوئی اتنا بڑا فاصلہ تو نہیں ہوتا مگر موٹروں کا کاروبار کرتے اور دولت کے انبار سمیٹتے سمیٹتے بہت سا چاندی سونا ان دونوں کے درمیان ڈھیر ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ جھگڑے ٹنٹوں سے انہیں نفرت تھی وہ خاموش زندگی بسر کرنے کے قائل تھے جس میں کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ لڑکی تھی' وہ اپنی انگریز نرس کے ساتھ کھیلتی رہتی تھی جب ان کے دل میں اس کا پیار ابھرتا تو وہ اسے اپنے پاس بلا کر کچھ عرصے کے لیے اپنی گود میں بٹھاتے اور انگریزی میں پیار کر کے اسے پھر نرس کے حوالے کر دیتے۔ جب کاروبار سے فارغ ہو کر گھر آتے تو زہرہ کے ہونٹوں کا بوسہ لیتے اور ڈنر کھانے میں مشغول ہو جاتے۔ اگر مسٹر احسن ان سے پہلے وہاں موجود ہوتے تو ہو ان کو بھی ڈنر میں شامل کر لیتے۔ ایسے موقعوں پر ضرورت بے ضرورت زہرہ مسٹر احسن کی خاطر داری کرتی۔ ان کی پلیٹ مختلف سالنوں سے بھر دیتی اور کو بڑے محبت بھرے انداز میں مجبور کرتی کہ وہ تکلف نہ کریں۔ جب وہ زہرہ کا یہ ناروا التفات دیکھتے تو ان کے دل اور دماغ کے درمیان سونے چاندی کے ڈھیر کچھ پگھل سے جاتے اور دونوں آپس میں سرگوشیاں کرنا شروع کر دیتے۔

مسٹر احسن رنڈوے تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ کراچی میں موتیوں کے سب سے بڑے تاجر تھے۔ کروڑپتی۔ ہر سال مسٹر معین سے موٹروں کے نئے ماڈل خریدتے تھے۔ زہرہ کی سالگرہ پر انہوں نے دو بڑے قیمتی ہار تحفے کے طور پر دیے تھے۔ جب مسٹر مرین نے انہیں قبول کرنے سے اپنے مخصوص دھیمے انداز میں انکار کیا تھا تو مسٹر احسن نے کہا تھا: "مجھے صدمہ ہوگا اگر یہ ہار مسز معین کے گلے کی زینت نہ بنے۔" یہ سن کر زہرہ نے دونوں ہار اٹھا کر مسٹر احسن کو دے دیے اور اس سے کہا: "لیجیے آپ اپنے ہاتھوں سے پہنا دیجیے۔"

جب زہرہ کے گلے میں پہنا دیے گئے تو بوجہ مجبوری مسٹر معین کو اپنے دوست مسٹر احسن کی ہاں میں ہاں ملانا پڑی کہ بھیرہ عرب

کے پانیوں میں سیپیوں نے ان ہاروں کے موتی خاص طور پر زہرہ ہی کے لیے پیدا کیے تھے۔

ایش ٹرے میں رکھا ہو سگار آہستہ آہستہ سلگ کر نصف کے قریب خاکستر اور سفید راکھ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ پاس ہی آرام کرسی پر مسٹر معین اسی طرح اپنے چوڑے ماتھے پر ایک ہاتھ رکھے گہری سوچ میں غرق تھے۔ وہ اتنا کبھی تردد نہ کرتے مگر اب ان کی عزت کا سوال درپیش تھا۔ آج انہوں نے اپنے کانوں سے ایک ایسا مکالمہ سنا تھا۔ ظاہر ہے کہ زہرہ اور احسن کے درمیان جس نے سکون پسند طبیعت کو درہم برہم کر دیا تھا۔

چوڑے ماتھے پر ہاتھ رکھے وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ ان کے کان بار بار وہ مکالمہ سن رہے تھے جو ان کی بیوی اور ان کے دوست کے درمیان بڑے کمرے میں ہوا تھا۔ دکان میں ایک موٹر کا سودا کرتے کرتے ان کی طبیعت اچانک ناساز ہو گئی: چنانچہ یہ کام منیجر کے حوالے کر کے وہ گھر روانہ ہو گے تاکہ آرام کریں۔ کریپ سول شو پہنے ہوئے تھے اس لیے کوئی آہٹ نہ ہوئی۔ دروازے کے پاس پہنچے تو انہیں زہرہ کی آواز سنائی دی:

''احسن صاحب! میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں ان سے طلاق حاصل کر لوں گی۔''

احسن بولے: ''مگر کیسے' کیونکر؟''

''میں آپ سے کئی بار کہہ چکی ہوں کہ وہ میری کوئی بات نہیں ٹالیں گے۔''

''تعجب ہے!''

''اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے آج تک میری ہر فرمائش پوری کی ہے۔ میں اگر ان سے کہوں کہ ان پانچ منزلوں سے نیچے کود جائیں تو وہ یقیناً کود جائیں گے۔''

''حیرت ہے۔''

''آپ کی حیرت دور ہو جائے گی جب میں کل ہی آپ کو طلاق نامہ دکھا دوں گی۔''

یہ مکالمہ سن کر مسٹر معین اپنی ناسازی طبع کو بھول گئے اور الٹے پاؤں واپس دکان پر چلے گئے جہاں ابھی تک موٹر کا سودا طے ہو رہا تھا۔ مگر انہوں نے اس سے کوئی دلچسپی نہ لی اور اپنے دفتر چلے گئے۔ سگار سلگایا مگر ایک کش لینے کے بعد اسے ایش ٹرے میں رکھ دیا اور سر پکڑ کر آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ ظاہر ہے کہ زہرہ نے جو کچھ کہا وہ مسٹر معین کی غیرت کے نام پر ایک زبردست چیلنج تھا۔ انہوں نے اپنے چوڑے ماتھے پر سے ہاتھ اٹھایا اور ایش ٹرے میں سگار کو بجھا کر ایک نیا سگار نکالا اور اسے سلگایا۔ آہستہ آہستہ وہ ہونٹوں

میں اسے گھمانے لگے۔ پھر ایک ایک دم اٹھے اور دکان سے باہر نکل کر موٹر میں سوار ہوئے اور گھر کا رخ کیا۔

ان کے دوست مسٹر احسن جا چکے تھے۔ زہرہ اپنے کمرے میں سنگار میز کے پاس بیٹھی میک اپ کرنے میں مشغول تھی۔ جب اس نے آئینے میں معین کا عکس دیکھا تو بغیر مڑے ہونٹوں پر لپ اسٹک ٹھیک کرتے ہوئے کہا: ''آپ جلدی آ گئے۔''

''ہاں طبیعت ٹھیک نہیں۔'' صرف اتنا کہہ کر وہ بڑے کمرے میں جا کر صوفے پر دراز ہو گئے۔ سگار ان کے ہونٹوں میں بڑی تیزی سے گھومنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد بنی ٹھنی زہرہ آئی۔ مسٹر معین نے اس کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں اس کے حسن کا اعتراف کیا۔ یہ اعتراف وہ متعدد مرتبہ اپنے دل میں کر چکے تھے۔

دراز قد بہت موزوں و مناسب گدرایا ہوا جسم' بڑی بڑی غلافی آنکھیں' شرقی رنگ کی۔ اس پر ہر لباس سجتا تھا۔ بوہری لباس بھی جس سے معین کو سخت نفرت تھی۔ جب زہرہ پاس آئی اور اس نے ایک ادا کے ساتھ اپنے خاوند کا مزاج پوچھا تو وہ خاموش رہے۔ جب وہ اس کے پاس بیٹھ گئی تو معین صوفے پر سے اٹھے اور منہ سے سگار نکال کر بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنی بیوی سے مخاطب ہوئے: ''زہرہ! کیا تم مجھ سے طلاق لینا چاہتی ہو؟'' زہرہ ایک لمحے کے لیے بوکھلا سی گئی۔ مگر فوراً ہی سنبھل کر اس نے اپنے خاوند سے پوچھا: ''آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''میں نے تمہاری اور احسن کی گفتگو سن لی تھی۔'' معین کے لہجے میں غم و غصے کا شائبہ تک نہ تھا۔ زہرہ خاموش رہی۔ معین نے سگار کا ایک کش لیا اور کہا: ''میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔''

زہرہ اٹھ کھڑی ہوئی: ''کیوں؟''

معین نے کچھ سوچا: ''میں سوسائٹی میں اپنے نام اور اپنی عزت پر حرف آتا نہیں دیکھ سکتا۔''

''لیکن..... '' زہرہ اٹک گئی۔ ''لیکن میں اس سے وعدہ کر چکی ہوں۔''

''تو کوئی دوسری راہ تلاش کرنی چاہیے۔ طلاق میں کبھی نہیں دوں گا۔ اس لیے کہ میری عزت کا سوال ہے۔ ویسے مجھے تمہارے وعدے کا پاس ہے۔ یہ کہہ کر انہیں نے سگار ایش ٹرے میں رکھ دیا۔ میاں بیوی تھوڑی دیر تک خاموش رہے۔ آخر زہرہ فکرمند لہجے میں بولی۔

''لیکن میں طلاق لیے بغیر اس سے شادی کیسے کر سکتی ہوں؟''

''کیا تم واقعی اس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟'' زہرہ نے اثبات میں سر ہلایا تو معین نے اس سے سوال کیا: ''کیوں؟''

زہرہ خاموش رہی۔ معین نے ایک اور سوال کیا: "کیا اس لیے کہ تمہارے دل میں اب میری محبت نہیں ہے؟"

"میرے دل میں آپ کی محبت ویسی کی ویسی موجود ہے اور اس کے لیے میں خدا کی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ لیکن معلوم نہیں کیوں میرا جی چاہتا ہے کہ احسن کے ساتھ رہوں۔" یہ کہہ کر زہرہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ معین نے اپنے منہ سے سگار نکالا اور کہا: تم اس کے ساتھ رہ سکتی ہو۔"

زہرہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مگر ایک شرط پر" معین نے سگار ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے کہا: "تم میرے پاس بھی رہا کرو گی۔ تاکہ لوگوں کو کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ ان کو ایسی باتیں بنانے کا موقع نہ ملے کہ معین چونکہ اپنی بیوی کی فرمائشیں پوری نہ کر سکا اس لیے اس نے طلاق لے کر ایک کروڑ پتی سے شادی کر لی یا یہ کہ معین کی بیوی بدکردار تھی اس لیے اس نے اسے طلاق دے دی۔"

"بدکردار تو میں ہوں۔" زہرہ نے اپنی موٹی موٹی غلافی آنکھیں ایک لمحے کے لیے جھکا لیں۔ معین نے اسے دلاسا دیا۔

"اس کا ثبوت صرف میرا اعتراف ہے جو میری زبان پر کبھی نہیں آئے گا۔ اس لیے کہ یہ میری اپنی عزت اور میرے اپنے ناموس پر حرف لانے کا موجب ہوگا۔ اس کے علاوہ مجھے تم سے محبت ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تم ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو جاؤ۔"

"یہ کہہ کر معین کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے سینے کا سارا بوجھ اتر گیا ہے۔

زہرہ نے احسن کو ساری بات بتا دی۔ وہ راضی ہو گیا۔ چنانچہ زہرہ اس کے پاس کئی کئی دن رہنے لگی۔ احسن زہرہ کے جسمانی خلوص اور اس کے خاوند کے بے مثل ایثار سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے تھوڑے ہی عرصے کے بعد وصیت لکھ کر اپنی تمام جائیداد کی وارث زہرہ قرار دی۔

زہرہ نے اس کا ذکر اپنے خاوند سے نہ کیا اس کے وقار کو صدمہ پہنچتا۔ وہ اپنی لڑکی کو دیکھنے اور معین سے ملنے کے لیے اکثر آتی اور بعض اوقات چند راتیں بھی وہیں گزارتی۔ میاں بیوی کی یہ نئی زندگی بڑی ہموار گزر رہی تھی کہ اچانک ایک دن مسٹر احسن حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث انتقال کر گئے۔ نماز جنازہ میں سوسائٹی کی اونچی اونچی ہستیوں کی صف میں مسٹر معین بھی شریک تھے۔ انہوں نے اپنے مرحوم دوست کی مغفرت کے لیے صدق دل سے دعا کی اور گھر آ کر مناسب و موزوں الفاظ میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہوئے زہرہ کو دلاسا دیا۔

زہرہ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اور وہ گن گن کر احسن کی صفات بیان کر رہی تھی۔ آخر میں اس نے اپنے خاوند کو بتایا کہ

وہ اپنی ساری جائیداد اس کے نام کر گیا ہے۔ یہ سن کر مسٹر معین خاموش رہے اور زہرہ سے اس بارے میں کوئی استفسار نہ کیا۔

عدالت کے ذریعے جب زہرہ کو مرحوم احسن کی ساری جائیداد کا قبضہ مل گیا اور وہ خوش خوش گھر آئی تو دیکھا کہ ایک مولوی قسم کا آدمی صوفے پر بیٹھا ہوا ہے۔ ہاتھ میں اس کے ایک کاغذ ہے۔ اس کو ایک نظر دیکھ کر وہ اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی:

"قبضہ مل گیا ہے۔"

"مسٹر معین نے کہا: "بہت خوشی کی بات ہے۔" پھر انہوں مولوی صاحب کے ہاتھ سے کاغذ لیا اور زہرہ کی طرف بڑھا دیا:

"یہ لو!"

زہرہ نے کاغذ لے کر پوچھا: "یہ کیا ہے؟"

مسٹر معین نے بڑے پرسکون لہجے میں جواب دیا: "طلاق نامہ"

"ہاں" یہ کہہ کر معین نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور چیک نکالا: "یہ تمہارا حق مہر ہے بیس ہزار روپے۔"

زہرہ اور زیادہ بھوچکی رہ گئی: "مگر یہ سب کیا ہے؟"

"یہ سب یہ ہے کہ مجھے اپنی عزت اور اپنا ناموس بہت پیارا ہے۔ جب میری جان پہچان کے حلقوں کو یہ معلوم ہوگا کہ احسن تمہارے لیے ساری جائیداد چھوڑ مرا ہے تو کیا کیا کہانیاں گھڑی جائیں گی۔" یہ کہہ کر وہ مولوی صاحب سے مخاطب ہوا:

"آیئے قاضی صاحب!"

قاضی اٹھا۔ جاتے ہوئے مسٹر معین نے پلٹ کر اپنی مطلقہ بیوی کی طرف دیکھا اور کہا:

"یہ بلڈنگ بھی تمہاری ہے۔ رجسٹری کے کاغذات تمہیں پہنچ جائیں گے اگر تم نے اجازت دی تو میں کبھی تمہارے پاس آیا کروں گا" خدا حافظ!"



سودا بیچنے والی

سہیل اور جمیل دونوں بچپن کے دوست تھے۔ ان کی دوستی کو لوگ مثال کے طور پیش کرتے تھے۔ دونوں اسکول میں اکٹھے پڑھے۔ پھر اس کے بعد سہیل کے باپ کا تبادلہ ہو گیا اور وہ راولپنڈی چلا گیا۔ لیکن ان کی دوستی پھر بھی قائم رہی۔ کبھی جمیل راولپنڈی چلا جاتا اور کبھی سہیل لاہور آ جاتا۔

دونوں کی دوستی کا اصل سبب یہ تھا کہ وہ حسن پسند تھے۔ وہ خوبصورت تھے۔ بہت خوبصورت تھے۔ لیکن وہ عام خوبصورت لڑکوں کی مانند بدکردار نہیں تھے۔ ان میں عیب نہیں تھا۔

دونوں نے بی اے پاس کیا۔ سہیل نے راولپنڈی کے گارڈن کالج اور جمیل نے لاہور کے گورنمنٹ کالج سے۔ بڑے اچھے نمبروں پر۔ اس خوشی میں انہوں نے بہت بڑی دعوت کی۔ اس میں کئی لڑکیاں بھی شریک تھیں۔

جمیل قریب قریب سب لڑکیوں کو جانتا تھا۔ مگر ایک لڑکی کو جب اس نے دیکھا جس سے وہ قطعاً ناآشنا تھا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے سارے خواب پورے ہو گئے ہیں۔ اس نے اس لڑکی کے متعلق جس کا نام جمیلہ تھا' دریافت کیا تو معلوم ہو کہ وہ سلمٰی کی چھوٹی بہن ہے۔ سلمٰی کے مقابلے میں جمیلہ بہت حسین تھی۔ سلمٰی کی شکل صورت سیدھی سادی تھی لیکن جمیلہ کا ہر نقش تیکھا اور دلکش تھا۔ جمیل اس کو دیکھتے ہی اس کی محبت گرفتار ہو گیا۔

اس نے فوراً اپنے دل کے جذبات سے اپنے دوست کو آگاہ کر دیا۔ سہیل نے اس سے کہا: "ہو یار تم نے اس لڑکی میں کیا دیکھا ہے جو اس پر بری طرح لٹو ہو گئے ہو؟"

جمیل کو برا لگا: "تمہیں حسن کی پرکھ ہی نہیں ہے' اپنا اپنا دل ہے تمہیں اگر جمیلہ میں کوئی بات نظر نہیں آئی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے دکھائی نہ دی ہو۔"

سہیل ہنسا: "تم ناراض ہو رہے ہو۔ لیکن میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ تمہاری یہ جمیلہ برف کی ڈلی ہے اس میں حرارت نام کو بھی نہیں' عورت کا دوسرا نام حرارت ہے"

حرارت پیدا کر لی جاتی ہے"

"برف میں؟"

"برف بھی حرارت ہی سے پیدا ہوتی ہے۔"

"تمہارا یہ منطق عجیب و غریب ہے اچھا بھئی جو چاہتے ہو سو کرو میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ اسکا خیال اپنے دل سے نکال دو اس لیے کہ وہ تمہارے لائق نہیں ہے تم اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو۔"

دونوں میں ہلکی سی چخ ہوئی لیکن فوراً صلح ہو گئی۔ جمیل سہیل کے مشورے کے بغیر اپنی زندگی میں کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ اس نے جب اپنے دوست پر یہ واضح کر دیا کہ وہ جمیلہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تو سہیل نے اسے اجازت دے دی کہ جس قسم کی جھک چاہے مار سکتا ہے۔"

سہیل راولپنڈی چلا گیا۔ جمیل نے جو جمیلہ کے عشق میں بری طرح مبتلا تھا اس تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی مگر مصیبت تو یہ تھی کہ اس کی بڑی بہن سلمٰی اس کو محبت کی نظروں سے دیکھتی تھی۔

اس نے ان کے گھر آنا جانا شروع کیا اور سلمٰی بہت خوش ہوئی۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ جمیل اس کے جذبات سے واقف ہو چکا ہے اس لیے اس سے ملنے آتا ہے۔ چنانچہ اس نے غیر مبہم الفاظ میں اپنی محبت کا اظہار شروع کر دیا۔ جمیل سخت پریشان تھا کہ کیا کرے۔

جب وہ ان کے گھر جاتا تو سلمٰی اپنی چھوٹی بہن کو کسی نہ کسی بہانے سے اپنے کمرے میں سے باہر نکال دیتی اور جمیل دانت پیس کے رہ جاتا۔

کئی بار اس کے جی میں آئی کہ وہ سلمٰی سے صاف صاف کہہ دے کہ وہ کس غرض سے آتا ہے۔ اس کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ اس کی چھوٹی بہن سے محبت کرتا ہے۔

بے حد مختصر لمحات میں جو جمیل کی جمیلہ کی چند جھلکیاں دیکھنے کے لیے نصیب ہوتے تھے۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کئی باتیں کرنے کی کوشش کی اور یہ بارآور ثابت ہوا۔

ایک دن اسے جمیلہ کا رقعہ ملا جس کی عبارت یہ تھی:۔

"میری بہن جس غلط فہمی میں گرفتار ہیں اس کو آپ دور کیوں نہیں کرتے مجھے معلوم ہے کہ آپ مجھ سے ملنے آتے ہیں لیکن باجی کی موجودگی میں آپ سے کوئی بات نہیں ہو سکتی' البتہ آپ باہر جہاں بھی چاہیں میں آ سکتی ہوں۔"

جمیل بہت خوش ہوا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کون سی جگہ مقرر کرے اور پھر جمیلہ کو اس کی اطلاع کیسے دے۔ اس نے کئی محبت نامے لکھے اور پھاڑ دیے۔ اس لیے کہ ان کی ترسیل بڑی مشکل تھی۔ آخر اس نے یہ سوچا کہ سلمیٰ سے ملنے جائے اور موقع ملے تو جمیلہ کو اشارہ کر کے وہ جگہ بتا دے جہاں وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔

قریب قریب ایک مہینے تک وہ سلمیٰ سے ملنے جاتا رہا مگر کوئی موقع نہ ملا۔ لیکن ایک دن جب جمیلہ کمرے میں موجود تھی اور سلمیٰ اسے کسی بہانے سے باہر نکالنے والی تھی' جمیل نے بڑی بے ربطی سے بڑبڑاتے ہوئے کہا: "لارنس گارڈن پانچ بجے۔"

جمیلہ نے یہ سنا اور چلی گئی۔ سلمیٰ نے بڑی حیرت سے پوچھا "یہ آپ نے کیا کہا تھا؟"

"تم ہی سے تو کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا؟"

"لارنس گارڈن پانچ بجے

میں چاہتا تھا کہ تم کل لارنس گارڈن میرے ساتھ چلو۔ میرا جی چاہتا ہے ایک پکنک ہو جائے۔"

سلمیٰ خوش ہو گئی اور رضامند ہو گئی کہ وہ جمیل کے ساتھ دوسرے روز شام کو پانچ بجے۔ لارنس گارڈن میں ضرور جائے گی۔

وہ سینڈوچز بنانے میں مہارت رکھتی تھی چنانچہ اس نے بڑے پیار سے کہا: "چکن سینڈوچز کا انتظام میرے ذمے رہا۔"

اسی شام کو پانچ بجے لارنس باغ میں جمیل اور جمیلہ سینڈوچ بنے ہوئے تھے۔ جمیل نے اس پر اپنی والہانہ محبت کا اظہار کیا تو جمیلہ نے کہا: میں اس سے غافل نہیں تھی۔ پر کیا کروں بیچ میں باجی حائل تھیں۔"

"تو اب کیا کیا جائے؟"

ایسی ملاقاتیں زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکیں گی۔"

"یہ تو درست ہے کل تجھے صرف اس ملاقات کی پاداش میں تمہاری باجی کے ساتھ یہاں آنا پڑے گا۔"

"اسی لیے تو میں سوچتی ہوں کہ اس کا کیا حل ہو سکتا ہے۔"

"تم حوصلہ رکھتی ہو؟"

"کیوں نہیں آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے؟ میں ابھی آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں بتایئے کہاں چلنا ہے؟"

"اتنی جلدی نہ کرو مجھے سوچنے دو۔"

"آپ سوچ لیجیے۔"

"کل شام چار بجے تم کسی نہ کسی بہانے سے یہاں چلی آنا میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں گا۔ اس کے بعد ہم راولپنڈی روانہ ہو جائیں گے۔"

"طوفان بھی ہو تو میں کل اس مقررہ وقت پر یہاں پہنچ جاؤں گی۔"

"اپنے ساتھ زیور وغیرہ مت لانا۔"

"کیوں؟"

"میں تمہیں خود خرید کر دے سکتا ہوں۔"

"میں اپنے زیور نہیں چھوڑ سکتی باجی نے مجھے اپنی ایک بالی بھی آج تک پہننے کے لیے نہیں دی۔ میں اپنے زیور اس کے لیے چھوڑ جاؤں؟"

دوسرے دن شام کو سلمیٰ سینڈوچز تیار کرنے میں مصروف تھی کہ جمیلہ نے الماری میں سے اپنے زیور اور اچھے اچھے کپڑے نکالے انہیں سوٹ کیس میں بند کیا اور باہر نکل گئی۔ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہ ہوئی۔ سلمیٰ بیٹھی سینڈوچز تیار کرتی رہی اور جمیل اور جمیلہ دونوں ریل میں سوار تھے جو راولپنڈی کی طرف تیزی سے جا رہی تھی۔

راولپنڈی پہنچ کر جمیل اپنے دوست سہیل کے پاس گیا جو اتفاق سے گھر میں اکیلا تھا۔ اس کے والدین ایبٹ آباد میں منتقل ہو گئے تھے۔ سہیل نے جب ایک برقع پوش عورت جمیل کے ساتھ دیکھی تو بڑا متحیر ہوا' مگر اس نے اپنے دوست سے کچھ نہ پوچھا۔

جمیل نے اس سے کہا! "میرے ساتھ جمیلہ ہے میں اسے اغوا کر کے تمہارے پاس لایا ہوں"

سہیل نے پوچھا "اغوا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"بڑا لمبا قصہ ہے میں پھر کبھی تمہیں سنا دوں گا" پھر جمیل جمیلہ سے مخاطب ہوا: "برقع اتار دو اور اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔ سہیل میرا عزیز ترین دوست ہے۔"

جمیلہ نے برقع اتار دیا اور شرمیلی نگاہوں سے جن میں کسی اور جذبے کی بھی جھلک تھی' سہیل کی طرف دیکھا۔ سہیل کے ہونٹوں پر عجیب قسم کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اپنے دوست سے مخاطب ہوا: "اب تمہارا ارادہ کیا ہے؟"

جمیل نے جواب دیا: "شادی کرنے کا' لیکن فوراً نہیں۔ میں آج ہی واپس لاہور جانا چاہتا ہوں تا کہ وہاں کے حالات معلوم

ہو سکیں۔ ہو سکتا ہے بہت بری گڑ بڑ ہو چکی ہو۔ میں اگر وہاں پہنچ گیا تو مجھ پر کسی کو شک نہیں ہو گا۔ دو تین روز وہاں رہوں گا۔ اس دوران میں تم ہماری شادی کا انتظام کر دینا۔"

سہیل نے ذرا مذاق میں کہا بڑے سمجھدار ہوتے جا رہے ہو تم۔"

جمیلہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا: "یہ تمہاری صحبت کا نتیجہ ہے۔"

تم آج ہی چلے جاؤ گے؟"

جمیل نے جواب دیا: "ابھی اسی وقت۔ مجھے صرف اپنے اس سرمایہ حیات کو تمہارے سپرد کرنا تھا۔ یہ میری امانت ہے۔"

جمیل اپنی جمیلہ کو سہیل کے حوالے کر کے واپس لاہور آ گیا۔ وہاں کافی گڑ بڑ مچی ہوئی تھی۔ وہ سلمیٰ سے ملنے گیا۔ اس نے شکائت کی کہ وہ کہاں غائب ہو گیا تھا۔ جمیل نے اس سے جھوٹ بولا: "مجھے سخت زکام ہو گیا تھا۔ افسوس ہے کہ میں تمہیں اس کی اطلاع نہ دے سکا اس لیے کہ ہمارا ٹیلیفون خراب تھا اور نوکر کو امی جان نے کسی وجہ سے برطرف کر دیا تھا۔"

سلمیٰ جب مطمئن ہو گئی تو اس نے جمیل کو بتایا کہ اس کی بہن کہیں غائب ہو گئی ہے۔ بہت تلاش کی ہے مگر نہیں ملی۔ اپنے زیور کپڑے ساتھ لے گئی ہے معلوم نہیں کس کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

جمیل نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا۔ سلمیٰ اس سے بڑی متاثر ہوئی اور اسے مزید یقین ہو گیا کہ جمیل اس سے محبت کرتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جمیل نے محض رواداری کی خاطر اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کی نمناک آنکھیں پونچھیں اور مصنوعی محبت کا اظہار کیا۔ سلمیٰ اپنی بہن کی گمشدگی کا صدمہ کچھ دیر کے لیے بھول گئی۔

جب جمیل کو اطمینان ہو گیا کہ اس پر کسی کو بھی شبہ نہیں تو وہ ٹیکسی میں راولپنڈی پہنچا۔ بڑا بیتاب تھا۔ لاہور میں اس نے تین دن کانٹوں پر گزارے تھے۔ ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے جمیلہ کا حسین چہرہ رقص کرتا رہتا۔

دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جب اپنے دوست کے گھر پہنچا تو اس نے جمیلہ کو آواز دی۔ اس کو یقین تھا کہ اس آواز سنتے ہی وہ اڑتی ہوئی آئے گی اور اس کے سینے کے ساتھ چمٹ جائے گی مگر اسے ناامیدی ہوئی۔

اس کا دوست اس کی آواز سن کر آیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے ملے۔ جمیل نے تھوڑے توقف کے بعد پوچھا: "جمیلہ کہاں ہے؟"

سہیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ جمیل بڑا مضطرب تھا۔ اس نے پھر پوچھا: "یار جمیلہ کو بلاؤ"

سہیل نے بڑے رقت آمیز لہجے میں کہا: "وہ تو اسی روز چلی گئی تھی۔"

"کیا مطلب؟"

"جب تم یہاں اسے چھوڑ کر گئے تو وہ دو تین گھنٹوں کے بعد غائب ہو گئی۔

جمیل پھر لاہور آیا۔ سلمیٰ سے اسے معلوم ہو کہ اس کی بہن ابھی تک غائب ہے۔ بہت ڈھونڈا مگر نہیں ملی۔ چنانچہ جمیل کو پھر راولپنڈی جانا پڑا تا کہ وہ اس کی تلاش وہاں کرے۔ وہ اپنے دوست کے گھر نہ گیا۔ اس نے سوچا کہ ہوٹل میں ٹھہرنا چاہیے۔ جہاں سے مطلوبہ معلومات حاصل ہونے کی توقع ہو سکتی ہے۔ جب اس نے راولپنڈی کے ایک ہوٹل میں کمرہ کرایہ پر لیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی جمیلہ ساتھ والے کمرے میں سہیل کی آغوش میں ہے۔

وہ اسی وقت اپنے کمرے سے نکل آیا۔ لاہور پہنچا۔ جمیلہ کے زیورات اس کے پاس تھے یہ اس نے بیمہ کرا کر اپنے دوست کو بھیج دیے اور صرف چند الفاظ ایک کاغذ پر لکھ کر ساتھ رکھ دیے: "میں تمہاری کامیابی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ جمیلہ کو میرا سلام پہنچا دینا۔"

دوسرے دن وہ سلمیٰ سے ملا۔ وہ اس کو جمیلہ سے کہیں زیادہ خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اپنی بہن کی گمشدگی کے غم میں رو رہی تھی۔ جمیل نے اس کی آنکھیں چومیں اور کہا: یہ آنسو بیکار ضائع نہ کرو انہیں ان اشخاص کے لیے محفوظ رکھو جو ان کے مستحق ہوں۔"

"لیکن وہ میری بہن ہے۔"

"بہنیں ایک جیسی نہیں ہوتیں اسے بھول جاؤ۔"

جمیل نے سلمیٰ سے شادی کر لی۔ دونوں بہت خوش تھے۔ گرمیوں میں مری گئے تو وہاں انہوں نے جمیلہ جس کا حسن ماند پڑ گیا تھا اور نہایت واہیات قسم کا میک اپ کیے تھی پنڈی پوائنٹ پر یوں چل پھر رہی تھی جیسے اسے کوئی سودا بیچنا ہے۔



عشقیہ کہانی

میرے متعلق عام لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ میں عشقیہ کہانیاں نہیں لکھتا۔ میرے افسانوں میں چونکہ عشق و محبت کی چاندنی نہیں ہوتی اس لیے وہ بالکل سپاٹ ہوتے ہیں۔ میں اب یہ عشقیہ کہانی لکھ رہا ہوں تاکہ لوگوں کی یہ شکایت کسی حد تک دور ہو جائے۔

جمیل کا نام اگر آپ نے پہلے نہیں سنا تو اب سن لیجیے۔ اس کا تعارف مختصر طور پر کرائے دیتا ہوں۔ وہ میرا لنگوٹیا دوست تھا ہم اکٹھے اسکول میں پڑھے پھر کالج میں ایک ساتھ داخل ہوئے۔ میں ایف اے میں فیل ہو گیا اور وہ پاس۔ میں نے پڑھائی چھوڑ دی مگر اس نے جاری رکھی۔ ڈبل ایم اے کیا اور معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا۔ صرف اتنا سننے میں آیا تھا کہ اس نے ایک پانچ بچوں والی ماں سے شادی کر لی تھی اور آبادان چلا گیا تھا۔ وہاں سے واپس آیا یا وہیں رہا اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔

جمیل بڑا عاشق مزاج تھا۔ اسکول کے دنوں ہی میں اس کا جی بے قرار رہتا تھا کہ وہ کسی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔ مجھے ایسی گرفتاری سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن اس کی سرگرمیوں میں جو عشق سے متعلق ہوتیں برابر حصہ لیا کرتا تھا۔

جمیل دراز قد نہیں تھا مگر اچھے خد و خال کا مالک تھا۔ میرا مطلب ہے کہ اسے خوبصورت نہ کہا جائے تو اس کے قبول صورت ہونے میں شک و شبہ نہیں تھا۔ رنگ گورا اور سرخی مائل تیز تیز اس کے دل و دماغ میں سن بلوغت تک پہنچنے سے کچھ عرصہ پہلے ہی عشق کرنے کی زبردست خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ اس کو غالب کے شعر کا مفہوم اچھی طرح معلوم تھا۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

مگر اس کے برعکس وہ یہ آگ خود اپنی ماچس سے لگانا چاہتا تھا۔

اس نے اس کوشش میں کئی ماچسیں جلائیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کئی لڑکیوں کے عشق میں گرفتار ہو جانے کے لیے نت نئے سوٹ سلوائے بڑھیا سے بڑھیا ٹائیاں خریدیں سینٹ کی سینکڑوں قیمتی شیشیاں استعمال کیں مگر یہ سوٹ ٹائیاں اور سینٹ اس کی کوئی مدد نہ کر سکے۔

میں اور وہ دونوں شام کو کمپنی باغ کا رخ کرتے۔ وہ خوب سجا بنا ہوتا اس کے کپڑوں سے بہترین خوشبو نکل رہی ہوتی۔ باغ کی

روشوں پر متعدد لڑکیاں بدصورت خوبصورت قبول صورت محوِ خرام ہوتی تھیں۔ وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنے عشق کے لیے منتخب کرنے کی کوشش کرتا مگر ناکام رہتا۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا: "سعادت میں نے آخر کار ایک لڑکی چن ہی لی ہے۔ خدا کی قسم چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ میں کل صبح سیر کے لیے نکلا۔ بہت سی لڑکیاں مائی کے ساتھ اسکول جا رہی تھیں۔ ان میں ایک برقع پوش لڑکی نے جو اپنی نقاب ہٹائی تو اس کا چہرہ دیکھ کر میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ کیا حسن و جمال تھا بس میں نے وہیں فیصلہ کر لیا کہ جمیل اب مزید تنگ و دو چھوڑ و اس حسینہ ہی کے عشق میں تمہیں گرفتار ہونا چاہیے۔ ہونا کیا "تم ہو چکے ہو"

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر روز صبح اٹھ کر اس مقام پر جہاں اس نے اس کافر جمال حسینہ کو دیکھا تھا پہنچ جایا کرے گا اور اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرے گا۔

اس کے لیے اس کے ذہین دماغ نے پلین سوچے تھے۔ ایک جو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ قابل عمل اور زود اثر تھا اس نے مجھے بتا دیا تھا۔

اس نے حساب لگا کر سوچا تھا کہ دس دن متواتر اس لڑکی کو ایک ہی مقام پر کھڑے رہ کر دیکھنے اور گھورنے سے اتنا معلوم ہو جائے گا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ یعنی وہ کیا چاہتا۔ اس مدت کے بعد وہ اس کا ردعمل ملاحظہ کرے گا اور تجزیے کے بعد کوئی فیصلہ مرتب کرے گا۔

یہ اغلب تھا کہ وہ لڑکی اس کا دیکھنا گھورنا پسند نہ کرے۔ مائی سے یا اپنے والدین سے اس کے غیر اخلاقی رویے کی شکایت کر دے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ راضی ہو جاتی۔ اس کی ثابت قدمی اس پر اتنا اثر کرتی کہ اس کے ساتھ بھاگ جانے کو تیار ہو جاتی۔

جمیل نے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لیا تھا۔ شاید ضرورت سے زیادہ۔ اس لیے کہ دوسرے روز جب وہ الارم بجنے پر اٹھا تو اس نے اس مقام پر جہاں اس لڑکی سے اس کی پہلی مرتبہ مڈبھیڑ ہوئی تھی جانے کا خیال ترک کر دیا۔

اس نے مجھ سے کہا: "سعادت میں نے یہ سوچا کہ ہو سکتا ہے اسکول میں چھٹی ہو کیونکہ جمعہ ہے۔ معلوم نہیں اسلامی اسکول میں پڑھتی ہے یا کسی گورنمنٹ اسکول میں۔ پھر یہ بھی ممکن تھا کہ اگر میں اسے زیادہ شدت سے گھورتا تو وہ بھنا جاتی۔ اس کے علاوہ اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ دس دن کے اندر اندر مجھے اس کا ردعمل یقینی طور پر معلوم ہو جائے گا۔ بفرض محال وہ رضامند ہو جاتی میرا مطلب ہے مجھے بالمشافہ گفتگو کا موقع دے دیتی تو میں اس سے کیا کہتا!"

میں نے کہا: "یہی کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔"

جمیل سنجیدہ ہو گیا: "یار مجھ سے کبھی کہا نہ جاتا۔ تم سوچو! اگر یہ سن کر وہ میرے منہ پر یہ پتھر دے مارتی کہ جناب آپ کو اس کا کیا حق حاصل ہے' تو میں کیا جواب دیتا۔ زیادہ سے زیادہ میں یہ کہہ سکتا کہ حضور محبت کرنے کا حق ہر انسان کو حاصل ہے۔ مگر وہ ایک اور پتھر میرے مار سکتی تھی کہ تم بکواس کرتے ہو کون کہتا ہے کہ تم انسان ہو۔

قصہ مختصر یہ کہ جمیل اس حسین و جمیل لڑکی کی محبت میں خود کو اپنے تجربہ خودی کے باعث گرفتار نہ کرا سکا۔ مگر اس کی خواہش بدستور موجود تھی۔ ایک اور خوبرو لڑکی اس کی تلاش کرنے والی نگاہوں کے سامنے آئی اور اس نے فوراً تہیہ کر لیا کہ اس سے عشق لڑانا شروع کر دے گا۔

جمیل نے سوچا کہ اس سے خط و کتابت کی جائے چنانچہ اس نے پہلے خط کے کئی مسودے پھاڑنے کے بعد ایک آخری عشق و محبت میں شرابور تحریر مکمل کی جو میں یہاں من و عن نقل کرتا ہوں:

جانِ جمیل:

اپنے دل کی دھڑکنیں سلام کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ حیران نہ ہو جایئے گا کہ یہ کون ہے جو آپ سے یوں بے دھڑک ہم کلام ہے۔ میں عرض کیے دیتا ہوں۔ کل شام کو ساڑھے چھ بجے نہیں چھ بج کر گیارہ منٹ جب آپ امرت سینما کے پاس تانگے میں سے اتریں تو میں نے آپ کو دیکھا۔ بس ایک ہی نظر میں آپ نے مجھے مسحور کر لیا۔

آپ اپنی سہیلیوں کے ساتھ پکچرز دیکھنے چلی گئیں اور میں باہر کھڑا آپ کو اپنی تصور کی آنکھوں سے مختلف رویوں میں دیکھتا رہا۔ دو گھنٹے کے بعد آپ باہر نکلیں۔ پھر زیارت نصیب ہوئی اور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آپ کا غلام ہو گیا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا میں آپ کو اور کیا لکھوں۔ بس اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کیا آپ میری محبت کو اپنے حسن و جمال کے شایانِ شان سمجھیں گی یا نہیں۔

اگر آپ نے مجھے ٹھکرا دیا تو میں خودکشی نہیں کروں گا' زندہ رہوں گا تا کہ آپ کے دیدار ہوتے رہیں۔

آپ کے حسن و جمال کا پرستار

جمیل

یہ خط اس نے میرے گھر میں ایک خوشبودار کاغذ پر اپنی رف تحریر سے منتقل کیا تھا۔ لفافہ پھول دار اور خوشبودار تھا جس کو

جمالیاتی ذوق نے پسند نہیں کیا تھا۔

چند روز کے بعد جمیل مجھ سے ملا تو معلوم ہوا کہ اس نے یہ خط اس لڑکی تک نہیں پہنچایا۔ اولاً اس لیے کہ عشق کا آغاز خط سے کرنا مناسب نہیں ہے۔

ثانیاً اس لیے کہ اس خط کی تحریر بے ربط اور بے اثر ہے۔ اس نے خود کو لڑکی متصور کر کے یہ خط پڑھا اور اس کو بہت مضحکہ خیز معلوم ہوا۔

ثالثاً اس لیے کہ تفتیش کرنے کے بعد اس کو معلوم ہو کہ لڑکی ہندو ہے۔ یہ مرحلہ بھی شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔

اس کے گھر میں میرا آنا جانا تھا۔ مجھ سے کوئی پردہ وغیرہ نہیں تھا۔ ہم گھنٹوں بیٹھے پڑھائی یا گپ بازیوں میں مشغول رہتے۔ اس کی دو بہنیں بھی۔ چھوٹی چھوٹی۔ ان سے بڑی بے تکلفانہ قسم کی پُر لطف باتیں ہوتی رہیں۔ اس کی موسی کی ایک انتہا درجے کی سادہ لوح لڑکی عذرا تھی۔ عمر یہی کوئی سترہ اٹھارہ برس ہو گی۔ اس کا ہم دونوں بہت مذاق اڑایا کرتے تھے۔

جمیل کی جب دوسری کوشش بھی بار آور ثابت نہ ہوئی تو وہ دو مہینے تک خاموش رہا۔ اس دوران میں اس نے عشق میں گرفتار ہونے کی کوئی نئی کوشش نہ کی۔ لیکن اس کے بعد اس کو ایک دم دورہ پڑا اور اس نے ایک ہفتے کے اندر اندر پانچ چھ لڑکیاں اپنے عشق کی بندوق کے لیے نشانے کے طور پر منتخب کر لیں۔ پر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ صرف چار لڑکیوں کے متعلق مجھے اس کی عشقیہ مہم کے بارے میں علم ہے۔

پہلی نے جو اس کی دور دراز کی رشتے دار تھی اپنی ماں کے ذریعے اس کی ماں تک یہ الٹی میٹم بھجوا دیا کہ اگر جمیل نے اس کو پھر بری نظروں سے دیکھا تو اس کے حق میں اچھا نہ ہو گا۔

دوسری غور سے دیکھنے پر چیچک کے داغوں والی نکلی۔

تیسری کی چھٹے ساتویں روز ایک قصائی سے منگنی ہو گئی۔

چوتھی کو اس نے ایک لمبا عشقیہ خط لکھا جو اس کی موسی کی بیٹی عذرا کے ہاتھ آ گیا۔ معلوم نہیں کس طرح۔ پہلے جمیل اس کا مذاق اڑایا کرتا تھا' اب اس نے اڑانا شروع کر دیا۔ اتنا کہ جمیل کا ناک میں دم آ گیا۔

جمیل نے مجھے بتایا: "سعادت یہ عذرا جسے ہم بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح سمجھتے ہیں سخت ظالم ہے۔ سب سمجھتی ہے۔ جس لڑکی کو میں نے خط لکھا تھا اور غلطی سے اپنے میز کے دراز میں رکھ کر یہ سوچنے میں مشغول تھا کہ وہ اس کیا جواب لکھے گی' یہ کم بخت

جانے کیسے لے اڑی۔ اب اس نے میرا ناطقہ بند کر دیا ہے۔ بعض اوقات ایسی تلخ باتیں کرتی ہے کہ مجھے رلاتی ہے اور خود بھی روتی ہے۔ میں تو تنگ آ گیا ہوں۔"

اس سے بہت زیادہ تنگ آ کر اس نے اپنے عشق کی مہم اور تیز کر دی۔ اب کی اس نے چودہ لڑکیاں چنیں مگر اچھی طرح غور کرنے کے بعد ان میں سے صرف ایک باقی رہ گئی۔ دس اس کے مکان سے بہت دور رہتی تھیں جن کو ہر روز حتمی طور پر دیکھنے کے متعلق اس کا دل گواہی نہیں دیتا تھا۔ دو ایسی تھیں۔ جن کے خاندانی ہونے کے بارے میں اسے شبہ تھا۔ بارہ ہو گئیں۔ تیرھویں نے ایک دن ایسی بری طرح گھورا کہ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

چودھویں جو کہ چودھویں کا چاند تھی ملتفت ہو جاتی مگر وہ کم بخت کمیونسٹ تھی۔ جمیل نے سوچا تھا کہ اس کا التفات حاصل کرنے کے لیے وہ ضرور کمیونسٹ بن جاتا' کھادی کے کپڑے پہن کر مزدوروں کے حق میں دس بارہ تقریریں بھی کر دیتا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اس کے والد صاحب ریٹائرڈ انجینئر تھے' ان کی پنشن یقیناً بند ہو جاتی۔ یہاں سے ناامیدی ہوئی تو اس نے سوچا کہ عشق بازی فضول ہے شرافت یہی ہے کہ وہ کسی سے شادی کر لے۔ اس کے بعد اگر طبیعت چاہے تو اپنی بیوی کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔ چنانچہ اس نے مجھے اس فیصلے سے آگاہ کیا۔ طے یہ ہوا کہ وہ اپنی امی جان اور اپنے ابا جان سے بات کرے۔

بہت دنوں کی سوچ بچار کے بعد اس نے اس گفتگو کا مسودہ تیار کیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنی امی سے بات کی۔ وہ خوش ہوئیں۔ ادھر ادھر اپنے عزیزوں میں انہوں نے جمیل کے لیے موزوں رشتہ ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ پڑوس میں خان بہادر صاحب کی لڑکی تھی۔ ایم اے۔ بڑی ذہین اور طبیعت کی بہت اچھی مگر اس کی ناک چپٹی تھی۔ خالہ کی بیٹی حسن آرا تھی پر بے حد کالی تھی۔ صغریٰ تھی مگر اس کے والدین بڑے مسکین تھے۔ جہیز میں جتنے جوڑے جمیل کی ماں چاہتی تھی اس سے دو آدھے بھی دینے پر رضامند نہیں تھے۔ عذرا کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

جمیل کی ماں بڑی کوششوں کے بعد راولپنڈی کے ایک معزز اور متمول خاندان ان کی لڑکی سے بات چیت طے کر لی۔ جمیل اپنی ناکام عشق بازیوں سے اس قدر تنگ آ گیا تھا کہ اس نے اپنی ماں سے یہ بھی نہ پوچھا کہ شکل و صورت کی کیسی ہے۔ ویسے اس نے اپنے زندہ تصور میں اس کا اندازہ لگا لیا تھا اور مفصل طور پر سوچ لیا تھا کہ وہ اس کی محبت میں کس طرح گرفتار ہو گا۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ میں خوش تھا کہ جمیل کی شادی ہو رہی ہے۔ اس کے مرض متعلقہ بہ عشق کا ایک فقط یہی علاج تھا۔

چھ مہینے گزر گئے۔ آخر راولپنڈی کے اس معزز اور متمول خاندان کی لڑکی جس کا نام غالباً شریفہ تھا' سے اس کی منگنی ہو گئی۔

اس تقریب پر اسے سسرال کی طرف سے ہیرے کی انگوٹھی ملی۔ جو وہ ہر وقت پہنے رہتا تھا۔ اس پر اس نے ایک نظم بھی لکھی جس کا کوئی شعر مجھے یاد نہیں۔ ایک برس تک سوچتا رہا کہ اسے اپنی دلہن کو کب اپنے یہاں لانا چاہیے۔ آدمی چونکہ آزاد اور روشن خیال قسم کا تھا اس لیے اس کی خواہش تھی کہ ماں باپ سے علیحدہ اپنا گھر بنایا جائے۔ یہ کیسا ہونا چاہیے اس میں کس ڈیزائن کا فرنیچر ہو نوکر کتنے ہوں' ماہوار خرچ کتنا ہو گا' ساس کے ساتھ اس کا کیا سلوک ہو گا' ان تمام امور کے بارے میں اس نے کافی سوچ بچار کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکی والے تنگ آ گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ رخصتی کا مرحلہ جلد از جلد طے ہو۔

جمیل اس بارے میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ لیکن اس کی امی نے ایک تاریخ مقرر کر دی۔ کارڈ وارڈ چھپ گئے۔ ولیمے کی دعوت کے لیے ضروری سامان کا بندوبست کر لیا گیا۔ اس کے والد بزرگوار شیخ محمد اسماعیل صاحب ریٹائرڈ انجینئر بہت مسرور تھے۔ مگر جمیل بہت پریشان تھا۔ اس لیے کہ وہ اپنے بننے والے گھر کا آخری نقشہ تیار نہیں کر سکا تھا۔

رخصتی کی تاریخ نو اکتوبر مقرر کی گئی۔ ۱۸ اکتوبر کی شام کو بہت دیر تک میرا خیال ہے رات کے دو بجے تک اس آنے والے حادثے کے متعلق تبادلہ خیال کرتے ہوئے۔ لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچے آخر طے یہ ہوا کہ جو ہوتا ہے ہونے دیا جائے۔

اور ہوا یہ کہ ۱۹ اکتوبر کی صبح کو منہ اندھیرے جمیل میرے پاس سخت اضطراب اور کرب کے عالم میں آیا اور اس نے مجھے یہ خبر سنائی کہ اس کی موسی کی لڑکی عذرا نے جو بیوقوفی کی حد تک سادہ لوح تھی خودکشی کر لی ہے اس لیے کہ اس کو جمیل سے والہانہ عشق تھا۔ وہ برداشت نہ کر سکی کہ اس کے محبوب و معبود کی شادی کسی اور لڑکی سے ہو۔ اس ضمن میں اس نے جمیل کے نام ایک خط لکھا جس میں عبارت بہت دردناک تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ تحریر یادگار کے طور پر اس کے پاس محفوظ ہو گی۔



منظور

جب اسے ہسپتال میں داخل کیا گیا تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔ پہلی رات اسے آکسیجن میں رکھا گیا۔ جونرس ڈیوٹی پر تھی' اس کا خیال تھا کہ یہ نیا مریض صبح سے پہلے پہلے مرجائے گا۔ اس کی نبض کی رفتار غیر یقینی تھی۔ کبھی زور سے پھڑ پھڑاتی' کبھی لمبے لمبے وقفوں کے بعد چلتی تھی۔

پسینے میں اس کا بدن شرابور تھا' ایک لمحے کے لیے بھی اسے چین نہیں ملتا تھا۔ کبھی اس کروٹ لیتا' کبھی اس کروٹ۔ جب گھبراہٹ بہت زیادہ بڑھ جاتی تو اٹھ کر بیٹھ جاتا اور لمبے لمبے سانس لینے لگتا۔ رنگ اس کا ہلدی گھانٹھ کی طرح زرد تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں۔ ناک کا بانسا برف کی ڈلی۔ سارے بدن پر رعشہ تھا۔

ساری رات اس نے بڑی شدید کرب میں کاٹی۔ آکسیجن برابر دی جارہی تھی صبح ہوئی تو اسے کسی قدر افاقہ ہوا اور وہ نڈھال ہو کر سو گیا۔

اس کے دو تین عزیز آئے۔ کچھ دیر بیٹھے رہے اور چلے گئے۔ ڈاکٹروں نے انہیں بتا دیا تھا کہ مریض کو دل کا عارضہ ہے جسے ''کورونری تھرمبوس'' کہتے ہیں۔ یہ بہت مہلک ہوتا ہے۔ جب وہ اٹھا تو اسے ٹیکے لگا دیئے گئے۔ اس کے دل میں بدستور میٹھا میٹھا درد ہو رہا تھا۔ شانو کے پٹھے اکڑے ہوئے تھے جیسے رات بھر انہیں کوئی کوٹتا رہا تھا۔ جسم کی بوٹی بوٹی دکھ رہی تھی مگر نقاہت کے باعث وہ بہت زیادہ تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا۔ ویسے اس کو یقین تھا کہ اس کی موت دور نہیں' آج نہیں تو کل ضرور مرجائے گا۔

اس کی عمر تیس برس کے قریب تھی۔ ان برسوں میں اس نے کوئی راحت نہیں دیکھی تھی جو اسے یاد آتی اور اس کی صعوبت میں اضافہ کرتی۔ اس کے ماں باپ اس کو بچپن ہی میں داغ مفارقت دے گئے تھے۔ معلوم نہیں اس کی پرورش کس خاص شخص نے کی تھی۔ بس وہ ایسے ہی ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھاتا اس عمر تک پہنچ گیا تھا اور ایک کارخانے میں ملازم ہو کر پچیس روپے ماہوار پر انتہا درجے کی افلاس زدہ زندگی گزار رہا تھا۔

دل میں ٹیسیں نہ اٹھتی تو وہ اپنی تندرستی اور بیماری میں کوئی نمایاں فرق محسوس نہ کرتا۔ کیونکہ صحت اس کی کبھی اچھی نہ تھی۔ کوئی نہ

کوئی عارضہ اسے ضرور لاحق رہتا تھا۔

شام تک اسے چار ٹیکے لگ چکے تھے۔ آکسیجن ہٹالی گئی تھی۔ دل کا درد کسی قدر کم تھا اس لیے وہ ہوش میں تھا اور اپنے گردوپیش کا جائزہ لے سکتا تھا۔

وہ بہت بڑے وارڈ میں تھا جس میں اس کی طرح اور کئی مریض لوہے کی چارپائیوں پر لیٹے تھے۔ نرسیں اپنے کام میں مشغول تھیں۔ اس کے داہنے ہاتھ نو دس برس کا لڑکا کمبل میں لپٹا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''السلام علیکم۔'' لڑکے نے بڑے پیار سے کہا۔

نئے مریض نے اس کے پیار بھرے لہجے سے متاثر ہو کر جواب دیا: ''وعلیکم السلام۔'' لڑکے نے کمبل میں کروٹ بدلی: ''بھائی جان! اب اپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' نئے مریض نے اختصار سے کہا: ''اللہ کا شکر ہے۔''

لڑکے کا چہرا اور زیادہ تمتما اٹھا: ''آپ بہت جلدی ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ کا نام کیا ہے؟''

''میرا نام!'' نئے مریض نے مسکرا کر لڑکے کی طرف برادرانہ شفقت سے دیکھا۔

''میرا نام اختر ہے۔''

''میرا نام منظور ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک دم کروٹ بدلی اور اس نرس کو پکارا جو ادھر سے گزر رہی تھی۔ ''آپا جان۔'' نرس رک گئی۔ منظور نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سلام کیا۔ نرس قریب آئی اور اسے پیار کر کے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد اسسٹنٹ ہاؤس سرجن آیا۔ منظور نے اس کو بھی سلام کیا: ''ڈاکٹر جی اسلام علیکم۔''

ڈاکٹر سلام کا جواب دے کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور دیر تک اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس سے باتیں کرتا رہا جو ہسپتال کے بارے میں تھیں۔

منظور کو اپنے وارڈ کے ہر مریض سے دلچسپی تھی۔ اس کو معلوم تھا کس کی حالت اچھی ہے اور کس کی حالت خراب ہے۔ کون آیا ہے' کون گیا ہے۔ سب نرسیں اس کی بہنیں تھی اور سب ڈاکٹر اس کے دوست۔ مریضوں میں کوئی چچا تھا' کوئی ماموں اور کوئی بھائی۔ سب اس سے پیار کرتے تھے۔ اس کی شکل صورت معمولی تھی۔ مگر اس میں غیر معمولی کشش تھی۔ ہر وقت اس کے چہرے پر تمتماہٹ کھیلتی رہتی تھی جو اس کی معصومیت پر ہالے کا کام دیتی تھی۔ وہ ہر وقت خوش رہتا تھا۔ بہت زیادہ باتونی تھا۔ مگر اختر کو حالانکہ وہ دل کا مریض تھا اور اس مرض کے باعث بہت چڑچڑا ہو گیا تھا' اس کی یہ عادت کھلتی نہیں تھی۔

چونکہ اس کا بستر اختر کے بستر کے پاس تھا اس لیے وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد اس سے گفتگو شروع کر دیتا تھا جو چھوٹے چھوٹے معصوم جملوں پر مشتمل ہوتی تھی:

''بھائی جان آپ کے بھائی بہن ہیں؟''

''میں اپنے ماں باپ کا اکلوتا لڑکا ہوں۔''

''آپ کے دل میں اب درد تو نہیں ہوتا ہے۔''

مجھے معلوم نہیں دل کا درد کیسا ہوتا ہے۔'''' آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ دودھ زیادہ پیا کریں!

''میں بڑے ڈاکٹر جی سے کہوں گا' وہ آپ کو مکھن بھی دیا کریں گے۔''

بڑا ڈاکٹر بھی اسے بہت پیار کرتا تھا۔ صبح جب راؤنڈ پر آتا تو کرسی منگا کر اس کے پاس تھوڑی دیر تک ضرور بیٹھتا اور اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہتا۔

اس کا باپ درزی تھا۔ دوپہر کو پندرہ بیس منٹ آتا۔ سخت افراتفری کے عالم میں اس کے لیے پھل وغیرہ لاتا اور جلدی جلدی اسے کھلا کر اور اس کے سر پر محبت کا ہاتھ پھیر کر چلا جاتا۔ شام کو اس کی ماں آتی اور برقع اوڑھے دیر تک اس کے پاس بیٹھی رہتی۔

اختر نے اس وقت اس سے دلی رشتہ قائم کر لیا تھا جب اس نے اس کو سلام کیا تھا۔ اس سے باتیں کرنے سے یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا۔ دوسرے دن رات کی خاموشی میں جب اسے سوچنے کا موقع ملا تو اس نے محسوس کیا اس کو جو افاقہ ہوا ہے' منظور ہی کا معجزہ ہے۔ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ وہ صرف چند گھڑیوں کا مہمان تھا۔ منظور نے اس کو بتایا تھا کہ جب اسے بستر پر لٹایا گیا تو اس کی نبض قریب قریب غائب تھی۔ اس نے دل ہی دل میں کئی مرتبہ دعا مانگی تھی خدا اس پر رحم کرے۔ یہ اس کی دعا ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ مرتے مرتے بچ گیا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہے گا' اس لیے کہ اس کا مرض بہت مہلک تھا۔ بہر حال اب اس کے دل میں اتنی خواہش ضرور پیدا ہو گئی تھی کہ وہ کچھ دن زندہ رہے تاکہ منظور سے اس کا رشتہ فوراً نہ ٹوٹ جائے۔

دو تین روز گزر گئے۔ منظور سارا دن حسب معمول چہکتا رہا تھا۔ کبھی نرسوں سے باتیں کرتا' کبھی جمعداروں سے۔ یہ بھی اس کے دوست تھے۔ اختر کو تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ وارڈ کی بدبو دار فضا کا ہر ذرہ اس کا دوست ہے۔ وہ جس شے کی طرف دیکھتا تھا' وہ فوراً اس کی دوست بن جاتی تھی۔

دو تین روز گزرنے کے بعد اختر کو معلوم ہوا منظور کا نچلا دھڑ مفلوج ہے تو اسے سخت صدمہ پہنچا۔ لیکن اس کو حیرت بھی ہوئی کہ

اتنے بڑے نقصان کے باوجود وہ خوش کیونکر رہتا ہے۔ باتیں جب اس کے منہ سے بلبلوں کی مانند نکلتی تھیں تو انہیں سن کر کون کہہ سکتا تھا کہ اس کا نچلا دھڑ گوشت پوست کا بے جان لوتھڑا ہے۔

اختر نے اسے فالج کے متعلق کوئی بات نہ کی۔ اس لیے کہ اس سے ایسی بات کے متعلق پوچھنا بہت بڑی حماقت ہوتی جس سے وہ قطعاً بے خبر معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اسے کسی کے ذریعے سے معلوم ہو گیا کہ منظور ایک دن جب کھیل کود کر واپس آیا تو اس نے ٹھنڈے پانی سے نہا لیا جس کے باعث اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہو گیا۔

ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا انہیں بہت دکھ ہوا۔ شروع شروع میں حکیموں سے علاج کرایا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ پھر ٹونے ٹوٹکے کا سہارا لیا مگر بے سود۔ آخر کسی کے کہنے پر انہوں نے اسے ہسپتال میں داخل کروا دیا تاکہ باقاعدگی سے اس کا علاج ہوتا رہے۔

ڈاکٹر مایوس تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس کے جسم کا مفلوج حصہ کبھی درست نہ ہو گا مگر پھر بھی اس کے والدین کا جی رکھنے کے لیے وہ اس کا علاج کر رہے تھے۔ انہیں حیرت تھی کہ وہ اتنی دیر زندہ کیسے رہا۔ اس لیے کہ اس پر فالج کا حملہ بہت شدید تھا جس نے اس کے جسم کا نچلا حصہ بالکل ناکارہ کرنے کے سوا اس کے بدن کے بہت سے نازک اعضاء جھنجھوڑ کر رکھ دیے تھے۔ وہ اس پر ترس کھاتے تھے اور اس سے پیار کرتے تھے اس لیے کہ اس نے سدا خوش رہنے کا گر اپنی شدید علالت سے سیکھا تھا۔ اس کے معصوم دماغ نے یہ طریقہ خود ایجاد کیا تھا کہ اس کا دکھ دب جائے۔

اختر پر ایک بار پھر دورا پڑا۔ یہ پہلے دورے سے کہیں زیادہ تکلیف دہ اور خطرناک تھا مگر اس نے صبر و تحمل سے کام لیا اور منظور کی مثال سامنے رکھ کر اپنے دکھ درد سے غافل رہنے کی کوشش کی جس میں اسے کامیابی ہوئی ڈاکٹروں کو اس مرتبہ تو سو فی صد یقین تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکتی' مگر معجزہ رونما ہوا اور رات کو ڈیوٹی پر متعین نرس نے صبح سویرے اسے دوسری نرسوں کے سپرد کیا تو اس کی گرتی ہوئی نبض سنبھل چکی تھی۔ وہ زندہ تھا۔

موت سے کشتی لڑتے لڑتے نڈھال ہو کر جب وہ سونے لگا تو اس نے نیم مندی ہوئی آنکھوں سے منظور کی طرف دیکھا جو محو خواب تھا۔ اس کا چہرا دمک رہا تھا۔ اختر نے اپنے کمزور اور نحیف دل میں اس کی پیشانی کو چوما اور سو گیا۔

جب اٹھا تو منظور چہک رہا تھا۔ اس کے متعلق ایک نرس سے کہہ رہا تھا: ''آپا اختر بھائی جان کو جگاؤ۔ دوا کا وقت ہو گیا ہے۔''

''سونے دو۔ اسے آرام کی ضرورت ہے۔''

''نہیں۔ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ انہیں دوا دیجئے۔''

"اچھا دے دوں گی"

منظور نے جب اختر کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ بہت خوش ہو کر آواز بلند کہا: "السلام علیکم!"

اختر نے نقاہت بھرے لہجے میں جواب دیا: "وعلیکم السلام!"

"بھائی جان! آپ بہت سوئے۔"

"ہاں۔ شاید۔"

نرس آپ کے لیے دوا لا رہی ہے۔"

اختر نے محسوس کیا اس کی نحیف باتیں اس کے دل کو تقویت پہنچا رہی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ خود اس کی طرح چہکارنے لگا۔ اس نے منظور سے پوچھا: "اس مرتبہ بھی تم نے میرے لیے دعا مانگی تھی؟"

منظور نے جواب دیا: "نہیں۔"

"کیوں؟"

"میں روز دعائیں نہیں مانگا کرتا۔ ایک دفعہ مانگی' کافی تھی۔ مجھے معلوم تھا آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔" اس کے لہجے یقین تھا۔

اختر نے اسے ذرا سا چھیڑنے کے لیا کہا: "تم دوسروں سے کہتے رہتے ہو کہ ٹھیک ہو جاؤ گے' خود کیوں نہیں ٹھیک ہو ہوا کر گھر چلے جاتے۔"

منظور نے تھوڑی دیر سوچا: "میں بھی ٹھیک ہو جاؤں گا۔ بڑے ڈاکٹر جی کہتے تھے کہ تم ایک مہینے تک چلنے پھرنے لگو گے۔ دیکھیے نا اب میں اوپر نیچے کھسک سکتا ہوں۔"

اس نے کمبل میں اوپر نیچے کھسکنے کی ناکام کوشش کی۔ اختر نے فوراً کہا: "واہ منظور میاں واہ۔ ایک مہینہ کیا ہے۔ یوں گزر جائے گا"

منظور نے چٹکی بجائی اور خوش ہو کر ہنسنے لگا۔

ایک مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ اس دوران میں اختر پر دل کے دو تین دورے پڑے جو زیادہ شدید تھے۔ اب اس کی حالت بہتر تھی' نقاہت دور ہو رہی تھی۔ اعصاب میں پہلا سا تناؤ بھی نہیں تھا۔ دل کی رفتار بھی ٹھیک تھی۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا اب وہ خطرہ سے باہر ہے۔ لیکن ان کا تعجب بدستور قائم تھا کہ وہ بچ کیسے گیا۔

اختر دل ہی دل میں ہنستا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے بچانے والا کون ہے۔ وہ کوئی انجکشن نہیں تھا۔ کوئی دوا نہیں تھی۔ وہ منظور

تھا۔ مفلوج منظور۔ جس کا نچلا دھڑ بالکل ناکارہ ہو چکا تھا' اور جسے یہ خوش فہمی تھی کہ اس کے گوشت پوست کے بے جان لوتھڑے میں زندگی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں

اختر اور منظور کی دوستی بہت بڑھ گئی تھی۔ منظور کی ذات اس کی نظروں میں مسیحا کا رتبہ رکھتی تھی اس نے اس کو دوبارہ زندگی عطا کی تھی اور اس کے دل و دماغ سے وہ تمام کالے بادل ہٹا دیے تھے جن کے سائے میں وہ اتنی دیر تک گھٹی گھٹی زندگی بسر کر رہا تھا اس کی قنوطیت رجائیت میں میں تبدیل ہو گئی تھی' اسے زندہ رہنے سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بالکل ٹھیک ہو کر ہسپتال سے نکلے اور ایک نئی صحت مند زندگی بسر کرنی شروع کر دے۔

اسے بڑی الجھن ہوتی تھی جب وہ دیکھتا تھا کہ منظور ویسے کا ویسا ہے۔ اس کے جسم کے مفلوج حصے پر ہر روز مالش ہوتی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا تھا' اس کی خوش رہنے والی طبیعت شگفتہ سے سکفتہ ہو رہی تھی۔ یہ بات حیرت اور الجھن کا باعث تھی۔

ایک دن بڑے ڈاکٹر نے منظور کے باپ سے کہا کہ اب وہ اسے گھر لے جائے کیونکہ اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔

منظور کو صرف اتنا پتہ چلا کہ اس کا علاج اب ہسپتال کی بجائے گھر پر ہوگا اور بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر اسے سخت صدمہ پہنچا۔ وہ گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اختر نے جب اسے پوچھا کہ وہ ہسپتال کیوں رہنا چاہتا ہے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے: "وہاں اکیلا رہوں گا۔ ابو دکان پر جاتا ہے' ماں ہمسائی کے ہاں جا کر کپڑے سیتی ہے۔ میں وہاں کس سے کھیلا کروں گا۔ کس سے باتیں کیا کروں گا۔"

اختر نے بڑے پیار سے کہا: "تم اچھے ہو جاؤ گے منظور میاں۔ چند دن کی بات ہے پھر تم باہر اپنے دوستوں سے کھیلا کرنا۔ اسکول جایا کرنا!"

"نہیں نہیں۔" منظور نے کمبل میں اپنا سدا مسکرانے والا چہرہ ڈھانپ کر رونا شروع کر دیا اختر کو بہت دکھ ہوا۔ دیر تک وہ اسے چمکارتا رہا پچکارتا رہا۔ آخر اس کی آواز گلے میں رندھ گئی اور اس نے کروٹ بدل لی۔

شام کو ہاؤس سرجن نے اختر کو بتایا کہ بڑے ڈاکٹر صاحب نے اسے ریلیز کا آرڈر دے دیا ہے۔ وہ صبح جا سکتا۔ منظور نے سنا تو بہت خوش ہوا۔

اس نے اتنی باتیں کیں اتنی باتیں کیں' کہ تھک گیا۔ ہر نرس کو ہر اسٹوڈنٹ کو' ہر جمعدار کو اس نے بتایا کہ بھائی جان اختر جا رہے ہیں۔

رات کو بھی اختر سے دیر تک خوشی سے بھرپور ننھی منھی معصوم باتیں کرتا رہا۔ آخر سو گیا۔ اختر جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ منظور کب تک ٹھیک ہوگا۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی دوا موجود نہیں ہے جو اس پیارے بچے کو تندرست کر دے۔ اس نے اس کی صحت کے لیے صدق دل سے دعائیں مانگیں مگر اس کو یقین تھا کہ یہ قبول نہیں ہوں گی' اس لیے کہ اس کا دل منظور کا سا پاک دل کیسے ہو سکتا تھا۔

منظور اس کی جدائی کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے بہت دکھ ہوا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ صبح اس کو وہ چھوڑ کر چلا جائے گا اور اپنی نئی زندگی تعمیر کرنے میں مصروف ہو کر اسے اپنے دل و دماغ سے محو کر دے گا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ منظور کی "السلام علیکم" سننے سے پہلے ہی مر جاتا۔ یہ نئی زندگی جو اس کی عطا کردہ تھی' وہ کس منہ سے اٹھا کر باہر لے جائے گا۔

یہ سوچتے سوچتے اختر سو گیا۔ صبح دیر سے اٹھا۔ نرسیں وارڈ میں ادھر ادھر تیزی سے چل پھر رہی تھیں۔ کروٹ بدل کر اس نے منظور کی چارپائی کی طرف دیکھا۔ اس پر اس کی بجائے ایک بوڑھا ہڈیوں کا ڈھانچہ لیٹا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اختر پر سناٹا طاری ہو گیا۔ ایک نرس پاس سے گزر رہی تھی' اس سے اس نے قریب بلا کر پوچھا: "منظور کہاں ہے۔"

نرس رکی۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے بڑے افسوس ناک لہجے میں جواب دیا: "بیچارہ! صبح ساڑھے پانچ بجے مر گیا۔"

یہ سن کر اختر کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے سمجھا کہ یہ آخری دورہ ہے۔ مگر اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے ہسپتال سے رخصت ہونا پڑا۔

کیونکہ اس کی جگہ لینے والا مریض داخل کر لیا گیا تھا۔



مس اڈنا جیکسن

کالج کی پرانی پرنسپل کے تبادلے کا اعلان ہوا طالبات نے بڑا شور مچایا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں ان کی محبوب پرنسپل ان کے کالج سے کہیں اور چلی جائے۔ بڑا احتجاج ہوا۔ یہاں تک کہ چند لڑکیوں نے بھوک ہڑتال بھی کی مگر فیصلہ اٹل تھا ان کا جذباتی فیصلہ تھوڑے عرصے کے بعد ختم ہو گیا۔

نئی پرنسپل نے پرانی پرنسپل کی جگہ لے لی۔ طالبات نے شروع شروع میں اس سے بڑی نفرت و حقارت کا اظہار کیا مگر اس نے ان سے کچھ نہ کہا؟ حالانکہ اس کے اختیار میں سب کچھ تھا۔ وہ ان کو کڑی سے کڑی سزا دے سکتی تھی۔

ہر وقت اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیرتی رہتی۔ وہ سراپا تبسم تھی کالج میں کھلی ہوئی کلی کی طرح آتا اور جب واپس جاتی تو دن بھر گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود اس میں مرجھانے کے کوئی آثار نہ ہوتے۔

تھوڑے عرصے کے بعد کالج کی طالبات اس کی گرویدہ ہو گئیں۔ ہر وقت اس سے چمٹی رہتی۔ ایک دن جب کوئی جلسہ تھا' مس اڈنا جیکسن نے تقریر کی اور کہا: "میں بہت خوش ہوں کہ تم اب مجھ سے مانوس ہو گئی ہو۔ شروع شروع میں جیسا کہ میں جانتی ہوں تم مجھ سے نفرت کرتی تھیں میری بچیو! میں یہاں اپنی مرضی سے نہیں آئی تھی۔ مجھے یہاں میرے حاکموں نے بھیجا تھا۔ ایک دن آنے والا ہے جب تم سنجیدہ اور متین بن جاؤ گی۔ تمہاری گود میں بچے کھیلتے ہوں گے تم سے بھی کہیں زیادہ شریر اور نٹ کھٹ میں تمہاری پرنسپل ہوں۔ لیکن دل میں خیال کبھی نہ لانا کہ میں کوئی ظالم عورت ہوں میں تم سب سے محبت کرتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ مجھ سے بھی کوئی محبت کرے۔"

یہ تقریر سن کر لڑکیاں بہت متاثر ہوئیں اور مس جیکسن کی محبت میں اور زیادہ گرفتار ہو گئیں۔ سب دل ہی دل میں نادم تھیں کہ انہوں نے ایسی شریف اور شفیق پرنسپل کے آنے پر کیوں اعتراض کیا۔

ایک دن بی اے کی ایک لڑکی طاہرہ جس نے مس جیکسن کی آمد پر آوازے کسے تھے اور بڑے سخت الفاظ استعمال کیے تھے' پرنسپل کے کمرے میں تھی۔ طاہرہ کا سر جھکا ہوا تھا۔ خوف و ہراس اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ کاغذات پر دستخط کر رہی تھی۔ بے

حد منہمک تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب اس نے طاہرہ کی سسکیوں کی آواز سنی تو اس کو اس کی موجودگی کا علم ہوا۔ ایک دم چونک کر اس نے اپنا ننھا سا فونٹین پین ایک طرف رکھا اور اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کو یاد نہیں رہا تھا کہ اس نے طاہرہ کو بلایا ہے۔

"کیا بات ہے طاہرہ؟"

طاہرہ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے: "آپ آپ ہی نے تو مجھے یہاں طلب فرمایا تھا۔"

ایک لمحے کے لیے مس جیکسن خالی الدماغ رہی' لیکن اسے فوراً یاد آ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ طاہرہ کے نام ایک مرد کا محبت نامہ پکڑا گیا تھا۔ یہ اس کی ایک سہیلی ناہید نے مس جیکسن کے حوالے کر دیا تھا۔

یہ خط اس کی دراز میں محفوظ تھا۔ مس جیکسن کے مسکراتے ہوئے ہونٹ طاہرہ سے مخاطب ہوئے: "بیٹا یہ کیا بات ہے؟"

اس کے بعد اس نے میز کا دراز کھول کر خط نکالا اور طاہرہ سے کہا: "لو یہ تمہارا خط ہے پڑھ لو اور اگر چاہو تو مجھے ساری داستان سنا دو تاکہ میں تمہیں کوئی رائے دے سکوں۔"

طاہرہ کچھ دیر خاموش رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کہے۔

پرنسپل مس جیکسن نے اٹھ کر اس کے کاندھے پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا "طاہرہ! شرماؤ نہیں۔ ہر لڑکی کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں۔"

طاہرہ نے رونا شروع کر دیا۔ بوڑھا چپڑاسی کسی کام سے اندر داخل ہوا تو مس جیکسن نے اس سے کہا: "نظام دین! ابھی تم باہر ٹھہرو میں بلا لوں گی تمہیں۔"

جب وہ چلا گیا تو مس جیکسن نے بڑے پیار سے طاہرہ سے کہا: "محبت ایک عظیم جذبہ ہے۔ مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لیکن تمہاری عمر کی لڑکیاں اکثر دھوکا کھا جایا کرتی ہیں۔ مجھے تمام واقعات بتا دو۔ میں تم سے عمر میں بہت بڑی ہوں مگر مجھ سے آج تک کسی نے محبت نہیں کی لیکن میں نے کئی استوار اور نا استوار محبتیں دیکھی ہیں' بیٹا مجھ سے گھبراؤ نہیں۔ بیٹھ جاؤ۔"

طاہرہ کچھ دیر ہچکچاتی رہی۔ لیکن اس کے بعد اس نے اپنا دل کھول کر اپنی پرنسپل کے سامنے رکھ دیا اس نے بتایا کہ ایک نوجوان لیکچرار ہے جس سے وہ ٹیوشن لیتی ہے۔ قریب قریب ایک سال سے وہ باقاعدہ پانچ بجے اس کے گھر آتا رہا ہے۔ اس کی باتیں بڑی دلفریب ہیں شکل وصورت کے لحاظ سے بھی خوب ہے۔ فارسی کے اشعار کا مطلب سمجھاتا ہے تو ایک نقشہ کھینچ دیتا ہے۔ اس کی زبان میں غضب کی مٹھاس ہے۔

طاہرہ نے مزید بتایا کہ اس کے دل میں لیکچرار کے لیے جگہ پیدا ہو گئی۔ آہستہ آہستہ بے قرار رہنے لگی۔ اس کو ہر وقت اس کی یاد ستاتی۔ پانچ بجنے والے ہوتے تو اس کو یوں محسوس ہوتا کہ وہ مجسم گھڑی بن گئی ہے۔ اس کا رواں رواں ٹک ٹک کرنے لگتا۔ وہ اس سے زبانی تو کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس لیے کہ وہ شرم وحیا اجازت نہیں دیتی تھی۔ اس نے ایک رات اس لیکچرار کے نام خط لکھا۔ اس نے اپنی زندگی بھر میں ایسا خط کبھی نہیں لکھا تھا حالانکہ وہ اپنے خاندان میں خط لکھنے کے معاملے میں کافی مشہور تھی کہ ہر بات بڑے سلیقے سے لکھتی ہے لیکن یہ خط لکھتے ہوئے اسے بڑی دقتیں پیش آئیں۔

القاب کیا ہو' مضمون کیسا ہونا چاہیے' پھر یہ سوال بھی اس کے درپیش تھا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ یہ خط اس کے باپ کا حوالے کر دے۔

وہ ایک عرصے تک سوچتی رہی۔ اس کے دل میں کئی خدشے تھے لیکن آخر میں اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خط ضرور لکھے گی۔ چنانچہ اس نے رائٹنگ پیڈ کے کئی کاغذ ضائع کر کے چند سطور اس لیکچرار کے نام لکھیں۔

"آپ بڑے اچھے استاد ہیں۔ مجھے اس طرح پڑھاتے ہیں جیسے' جیسے آپ کو مجھ سے خاص لگاؤ ہے۔ ورنہ اتنی محنت کون استاد کرتا ہے۔ میرا تو یہ جی چاہتا ہے کہ ساری عمر آپ میرے استاد اور میں آپ کی شاگرد رہوں۔ بس اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں لکھ سکتی۔"

یہ خط اس نے کئی دن اپنے پرس میں رکھا۔ اس کے بعد جرات سے کام لے کر اس نے کاغذ کا یہ پرزہ اپنے استاد کی جیب میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ڈال دیا۔

دوسرے روز جب وہ شام کو ٹھیک پانچ بجے آیا تو اس کا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ اسے سخت مایوسی ہوئی۔ دو گھنٹے کے بعد جب وہ چلا گیا تو اس نے بڑے چڑچڑے پن سے اپنی کتابیں اٹھائیں اور اپنے کمرے میں جانے لگی۔ ایک کتاب اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ طاہرہ نے بڑی بے دلی سے اٹھائی تو اس کے اوراق میں سے کاغذ کا ایک ٹکڑا جھانکنے لگا۔ اس نے یہ ٹکڑا نکالا۔ اس پر چند الفاظ مرقوم تھے۔ طاہرہ کے زخمی جذبات پر مرہم کے پھاہے لگ گئے۔ اس کے استاد نے یہ لکھا تھا۔

"مجھے تمہاری تحریر مل گئی ہے۔ میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ زندگی بھر تمہارا استاد رہنے کا تو وعدہ نہیں کر سکتا لیکن خادم ضرور رہوں گا۔ میں استادی شاگردی سے تنگ آ گیا ہوں۔ تمہاری غلامی اس سے ہزار درجے بہتر ہوگی۔"

اس کے بعد دونوں میں کتابوں کے اوراق کی اوٹ میں خط و کتابت ہوتی رہی۔ لیکن طاہرہ کے والدین کو یکلخت شہر چھوڑنا پڑا اس لیے کہ اس کے باپ ظہیر کی تبدیلی کسی سلسلے میں دوسرے شہر میں ہو گئی۔

طاہرہ کو ہوسٹل میں داخل کر دیا گیا جس کی سپرنٹنڈنٹ مس جیکسن تھی۔ اس کا قیام اسی ہوسٹل میں تھا۔

کالج سے فارغ ہو کر آتی تو اپنے کمرے میں اکثر ناول پڑھتی رہتی۔ عجیب عجیب قسم کے ہوسٹل کی لڑکیاں اس کے پاس آتیں اور اس کے کئی ناول چرا کر لے جاتیں اور مزے لے لے پڑھتیں۔ پھر واپس وہیں پر رکھ کر دیتیں جہاں سے انہوں نے اٹھائے تھے مس جیکسن کو لڑکیوں کی اس شرارت کا کوئی علم نہیں تھا۔ طاہرہ نے بھی کئی ناول پڑھے اور اس کا عشق اپنے استاد کے عشق سے بڑھتا گیا۔ وہ ہوسٹل سے باہر نکل نہیں سکتی تھی اس لیے اس نے ایک خط لکھا اور اسے کسی نہ کسی طریقے سے اپنے استاد تک پہنچا دیا۔

یہ خط جو اس نوجوان لکچرار نے جواب میں لکھا تھا۔ غلط ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ یعنی ناہید کے پاس جس کو طاہرہ سے صرف اس لیے بغض تھا کہ وہ اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔ یہ خط اس نے پرنسپل کے حوالے کر دیا۔

طاہرہ جب اپنی ساری داستان سنا چکی جو مس جیکسن نے بڑی دلچسپی لیتے ہوئے سنی تو اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد طاہرہ سے کہا: ''اب تم کیا چاہتی ہو؟''

مجھے کچھ معلوم نہیں آپ جو فیصلہ فرمائیں گی مجھے منظور ہو گا۔''

مس جیکسن اپنی کرسی پر سے اٹھیں اور کہا: ''نہیں طاہرہ محبت کے معاملے میں مجھے فیصلہ دینے کا اختیار نہیں۔ یہ مذہب سے بھی زیادہ مقدس جذبہ ہے تم خود بتاؤ''

طاہرہ نے شرم سے بھری ہوئی آنکھیں جو نم آلود بھی تھیں جھکائیں صرف اتنا کہا ''میں ان سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

مس جیکسن نے ٹھیٹ پرنسپلانہ انداز میں پوچھا: ''کیا وہ بھی چاہتا ہے؟''

''اس نے ابھی تک اس خواہش کا اظہار نہیں کیا لیکن وہ......''

''میں سمجھتی ہوں۔ وہ بھی تو تم سے محبت کرتا ہے اسے کیا عذر ہو سکتا ہے لیکن کیا تمہارے والدین رضامند ہو جائیں گے؟''

''ہرگز نہیں ہوں گے۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ وہ میری منگنی ایک جگہ کر چکے ہیں۔''

''کہاں؟

''میری خالہ زاد بھائی کے ساتھ۔''

''ہم کرسچوں میں تو ایسا نہیں ہوتا۔''

''خیر چھوڑو اس بات کو۔ کیا تمہارے اس لیکچرار کو اپنے پاس بلا کر اس سے مفصل بات چیت کروں؟ طاہرہ یہ زندگی کا سوال ہے ایسا نہ ہو کوئی غلطی ہو جائے۔ میں عمر میں تم سے بہت بڑی ہوں۔ میں تمہیں صحیح مشورہ دوں گی۔ ایک مرتبہ تم مجھے اس سے مل لینے دو۔''

طاہرہ نے شکریہ ادا کیا: ''آپ ضرور ملئے لیکن...... اس سے کہہ دیجئے گا کہ......''

پرنسپل نے بڑی شفقت سے کہا: ''رک کیوں گئی ہو جو کچھ تم اس سے کہنا چاہتی ہو مجھ سے کہہ دو۔''

''جی بس صرف اتنا کہ اگر اس کے قدم مضبوط نہ رہے تو میں خودکشی کر لوں گی عورت زندگی میں صرف ایک ہی مرد سے محبت کرتی ہے۔''

محبت کا لفظ سنتے ہی پرنسپل مس اڈنا جیکسن کے دل کی جھریاں اور زیادہ گہری ہو گئیں۔ اس نے طاہرہ کے آنسو اپنے رومال سے بڑی شفقت کے ساتھ پونچھے اور رخصت کر دیا۔ اس کے بعد اس نے گھنٹی بجا کر چپڑاسی کو اندر بلایا۔ اس نے بڑے ضروری کاغذات اس کے میز پر رکھے۔ اس نے سرسری نظر سے ان کو دیکھا۔ ایک کاغذ پر طاہرہ کے اس لکچرار کے نام خط لکھا کہ وہ ازرہ کرم اس سے کسی وقت شام کو بورڈنگ ہاؤس میں ملے۔

اور یہ خط اس نے لفافے میں ڈالا پتہ لکھا اور چپڑاسی سے کہا فوراً سائیکل پر جائے اور یہ لفافہ لکچرار صاحب کو پہنچا دے۔

چپڑاسی چلا گیا۔

شام کو مس اڈنا جیکسن اپنے کمرے میں بیٹھی پرچے دیکھ رہی تھی کہ نوکر نے اطلاع دی کہ ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔

وہ سمجھ گئی کہ یہ کون ہیں چنانچہ اس نے نوکر سے کہا: ''انہیں اندر لے آؤ''

طاہرہ کا استاد ہی تھا جو اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ مس جیکسن نے اس کا استقبال کیا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ جون کا مہینہ تھا۔ سخت تپش تھی مس جیکسن اس سے بڑے اخلاق کے ساتھ پیش آئی۔ نوجوان لکچرار بہت متاثر ہوا۔

ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ مس اڈنا جیکسن طاہرہ کے بارے میں بات شروع کرنے ہی والی تھی کہ اس پر ہسٹریا کا دورہ پڑ

گیا۔ اس کو یہ مرض بہت دیر سے لاحق تھا۔ لکچرار بہت فکر مند ہوا۔ گھر میں کوئی نوکر نہیں تھا اس لیے کہ وہ چھٹی کر کے کہیں باہر سو رہے تھے۔ اس نے خود ہی جو اس کی سمجھ میں آیا کیا۔

جب کالج گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد کھلا تو لڑکیوں کو یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ ان کی پرنسپل مس اڈنا جیکسن سے اس لکچرار کی شادی ہو گئی ہے جس کو طاہرہ سے محبت تھی۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ لکچرار لطیف کی عمر پچیس برس کے قریب ہوگی اور مس اڈنا جیکسن کی لگ بھگ پچاس برس۔

